© rasailojaraid.com

مطالعۂ سیرت: قرآن اور عقل کی روشنی میں

(اردو کتب سیرت کے تناظر میں)

عاصم نعیم ☆

ABSTRACT

Muslims believe that Prophet Muhammad ﷺ is a divine Messenger for all humanity and for all times being the last in the chain of Prophethood. Thus his biography became one of the most authentic sources of Islamic teaching. Scholars of all times wrote extensively on this subject from different angles. One of these approaches is to study *Sirah* rationally in the light of Quran, reasoning and the authentic Prophetic traditions (*Ahadith*). Shibli Nuemani's *Seerat-ul-Nabi* has a distinct position in this context. Later Hamid-ud-din Farahi and Amin Ahsan Islahi develpoed this approach for further studies.

This paper elaborates the features of this important trend in *Sirah* writings particularly focussing on three important biographies of the Holy Prophet ﷺ, written by Shibli Nuemani, Jafar Shah Phulwari and Khalid Masood.

قرآنِ حکیم اور سنت و سیرتِ رسولؐ کا باہمی تعلق ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ مکی زندگی میں دعوت کے ابتدائی مراحل سے لے کر حجۃ الوداع کے آخری اجتماع تک قدم قدم پر آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی ملتی رہی۔ آپؐ کی حیات طیبہ کا ایک ایک واقعہ قرآن حکیم کی ترجمانی کرتا ہے اور اس کے احکام کی صحیح عملی تصویر پیش کرتا ہے۔ بایں وجہ قرآن حکیم میں عہدِ رسالتؐ کے تاریخی واقعات کے اخبار بھی ہیں[1]

☆ لیکچرر، شعبہ علومِ اسلامیہ، یونیورسٹی آف دی پنجاب، لاہور

۱- ملاحظہ ہو: ال عمران: ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۳۰، ۱۵۲، بنی اسرائیل: ۱، القریش: ۱-۵، ق: ۲، اللھب: ۱تا۵،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور آپؐ کے فضائل و خصائص کا تذکرہ بھی[۲]۔ وہ آیات بھی ہیں جن میں آپؐ کو کفار و منافقین کے مقابلے میں تسلی دی گئی ہے[۳] اور وہ آیات بھی جن میں تنبیہ کے پیغامات ہیں[۴]۔ آپؐ کی اطاعت و اتباع کے احکام پر مشتمل آیات بھی ہیں[۵] اور آپؐ کو امرونہی کا کامل اختیار دینے کے اشارات بھی[۶]۔ یہی وجہ ہے کہ تمام معروف سیرت نگاروں نے سیرتِ نبویہ کے لیے بنیادی ماخذ قرآن مجید ہی کو قرار دیا ہے[۷]۔

۲۔ ملاحظہ کیجئے: اٰل عمران : ۱۵۹، الاحزاب: ۴۵، ۴۶، النساء: ۱۷۴، التوبہ: ۲۰، الانشراح: ۱تا۸، الاعراف: ۱۹، البلد: ۱-۲، الضحیٰ: ۴-۶

۳۔ دیکھیے: ال عمران: ۱۷۶، الطور: ۴۸، الحجرات: ۴، الانعام: ۵۷، یوسف: ۱۰۸، العنکبوت: ۴۸، ۴۹، الشوریٰ: ۵۲، القصص: ۸۶

۴۔ دیکھیے: التوبہ: ۴۳، الانفال: ۶۸، العبس: ۱

۵۔ ملاحظہ کیجیے: الاحزاب: ۲۱، النساء: ۵۹، ۶۴، اٰل عمران: ۳۲، وغیرہ آیات

۶۔ جیسے: الاعراف: ۱۵۷، التوبۃ: ۲۹

۷۔ بعض مصنفین نے سیرتِ نبوی کو قرآن حکیم کی نزولی ترتیب اور شانِ نزول کے آئینے میں دیکھا ہے بعض نے عقیدت و توصیف کے جذبہ کے تحت پورے قرآن کو نعت و مدحتِ نبویؐ قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ہمہ قرآن در شانِ محمدﷺ، اس زاویۂ فکر و اسلوب کے تحت کئی کتب سیرتی ادب کا حصہ ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی (۱۸۹۲ء-۱۹۷۷ء) کی **سیرۃ نبوی قرآنی**، کراچی، ادارۃ القرآن، مولانا عبدالشکور لکھنوی (۱۸۷۶ء-۱۹۶۲ء) کی **سیرت الحبیب الشفیع من کتاب العزیز الرفیع**، لکھنؤ، مکتبہ اہلِ سنت، مولانا اسجد قاسمی ندوی کی **سیرت نبویہؐ قرآن مجید کے آئینہ میں**، کراچی، ادارۃ الانوار اور محمد نصیب کی **سیرت النبیؐ قرآن حکیم کے آئینہ میں**، لاہور، مکتبہ اشاعت علوم اسلامیہ، شامل ہیں۔ مذکورہ کتب دراصل قرآن حکیم کی اُن آیات کا مطالعہ ہیں جن کا کسی طرح سیرتِ نبویﷺ سے تعلق ہے۔ ان آیات کے تحت سیرتِ نبویﷺ سے متعلقہ کوئی سوانحی عنوان دے کر تھوڑی سی تفصیل بیان کر دی جاتی ہے۔ اس طرزِ بیان میں تاریخی و سوانحی ترتیب مفقود ہوتی ہے۔ جیسے اسجد قاسمی ندوی کی کتاب میں اس طرح کی کوئی منطقی ترتیب موجود نہیں ہے۔ عنوان نمبر ۴۳ ہے یہودیت و عیسائیت کی دعوت، عنوان نمبر ۴۴ ہے: تحویل قبلہ جب کہ عنوان نمبر ۴۵ ہے: حضرت ابراہیمؑ مسلم تھے۔ عنوان نمبر ۴۶: اجازت جہاد، عنوان نمبر ۴۷: یہود بنو قینقاع کی ہٹ دھرمی اور عنوان نمبر ۴۸: صبح ایمان، شام کفر، وغیرہ۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کی کتاب چند خطبات کا مجموعہ ہے جن کے عنوانات کی ترتیب کچھ یوں ہے: ظہور کی پیش خبریاں، نام، نسب، وطن، زمانہ، رسالت و بشریت، ہجرت، مشرکین، منافقین وغیرہ۔ محمد نصیب کی **سیرت النبیؐ قرآن حکیم کے آئینہ میں**، بھی اسی اسلوب کے تحت ہے۔ مؤلف نے سیرت سے متعلقہ قرآنی آیات کی تفسیر مختلف تفاسیر سے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مختصر ذاتی آراء بھی دی گئی ہیں۔ عنوانات، نزولِ قرآن، اطاعتِ رسول، تعظیم وتکریم رسول، صفاتِ رسول، اعتراضات کفار، جواباتِ رب کریم، فضائل ہجرت، کعبہ مرکز ملت اسلامیہ وغیرہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برصغیر پاک وہند میں فکرِ اسلامی کے ارتقا کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ سید مجدد الف ثانی (۱۵۶۴ء-۱۶۲۵ء)، شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء)، مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۸۸۰ء)، شاہ اسمٰعیل شہید (۱۷۷۹ء- ۱۸۸۳ء)، سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء- ۱۸۹۸ء)، حمید الدین فراہی (۱۲۸۰ھ -۱۳۴۰ھ) اور علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء)، متعدد اعاظم رجال کے نام اس تاریخ کا حصہ ہیں۔

اس خطہ کے علمی دبستانوں میں ایک دبستانِ فکر یہ رہا ہے کہ اسلامی علوم قرآن مجید کی حاکمیت کے تحت ہوں۔ یعنی حدیث و فقہ، سیرت و تاریخ اور تصوف و فلسفہ کو قرآن مجید کی روشنی میں دیکھا جائے۔ قرآن کو اصل اور حدیث کو فرع سمجھا جائے۔ اس لیے کہ قرآن کی صحت قطعیت کے ساتھ ثابت ہے جب کہ روایت و حدیث میں ان کے نزدیک اس بات کا احتمال ہے کہ وہ صحیح طور پر محفوظ نہ کی گئی ہو۔ اس لیے روایاتِ سیرت اور احادیث کو قرآن مجید کے ساتھ درایتی وعقلی معیارات پر جانچا اور پرکھا جائے۔ اگر وہ قرآن حکیم اور عقل کے مسلمات کے مطابق ہوں تو انہیں قبول کر لیا جائے بصورت دیگر ان کی ایسی تاویل و توجیہ کی جائے کہ یہ قرآنِ حکیم اور مسلماتِ عقل کے مطابق ہو جائیں۔ اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ اس فکر کے حاملین احادیث پر درایتی نقد کے علم بردار ہیں اور احادیث کو قرآن مجید کی روشنی میں سمجھتے ہیں۔ جو روایات ان کو قرآن اور عقل سے موافق نظر آتی ہیں ان کو قبول کر لیتے ہیں، جو قرآن اور عقل سے معارض معلوم ہوتی ہیں انہیں استدلال کی بنا بنانے سے گریز کرتے ہیں[(۸)]۔ مثال کے طور پر جناب حمید الدین فراہی نے سورہ عبس کے شانِ نزول کی روایات میں سے حضرت عائشہؓ، حضرت انسؓ، مجاہدؒ اور ضحاکؒ کی روایات پر یہ تبصرہ کیا ہے۔ اس سے چند نتائج مرتب ہوتے ہیں:

(الف) ان سب روایات کی سند ضعیف ہے، (ب) ان کا دیا ہوا تأثر قرآن کے اشارات کے منافی ہے، (ج) روایات میں باہم اس طرح اختلاف ہے کہ ان کی حیثیت اوہام کی ہو کر رہ گئی ہے، (د) ابتدائی راویوں میں کوئی بھی خود شریکِ واقعہ نہ تھا، لہٰذا یہ روایات خبر کا فائدہ نہیں دیتیں، (ہ) ان کو قبول کرنے سے اللہ تعالی کی غیب دانی اور نبی ﷺ کے بارے میں بدگمانی پیدا ہوئی ہے، جو قابل قبول نہیں، روایت اگر صحیح ہوتی تو اس سے غلط نتائج پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ اس بحث کے بعد انہوں نے مجاہد کی ایک روایت کو اختیار کیا ہے جس پر یہ اعتراضات وارد نہ ہوتے تھے[(۹)]۔

جناب فراہی احادیث و روایاتِ سیرت کے ردّ و قبول میں عام طور پر محدثین کے اصولوں کی پیروی

۸- تفصیل کے لیے دیکھیے: فراہی، **تفسیر نظام القرآن**، سرائے میر، ادارۃ الاصلاح، ۲۰۰۳ء، نیز دیکھیے: ابوسفیان اصلاحی، مولانا حمیدالدین فراہی، مفسر و محقق، علی گڑھ، فرانک ریسرچ سنٹر، ۲۰۰۸ء، شرف الدین اصلاحی، **ذکرِ فراہی**، لاہور، دارالتذکیر

۹- فراہی، **مجموعہ تفاسیرِ فراہی**، لاہور، فاران فاونڈیشن، ۱۹۸۸ء، ص ۲۵۸-۲۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کرتے بلکہ بکثرت ایسی ضعیف روایات کو، جن کی صحت پر محدثین کو کلام ہے اس بنا پر قبول کر لیتے ہیں کہ وہ قرآن سے مطابقت رکھتی اوراس کی تصدیق کرتی ہیں (۱۰)۔

اس مقالے میں ہم نے تین نمائندہ کتب سیرت کا انتخاب کیا ہے۔ جس سے اس نقطہ نظر کے خدوخال پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں۔

''سیرۃ النبیؐ'' از علامہ شبلی نعمانی

مذکورہ فکر پر کئی پہلوؤں سے پورا اترنے والی پہلی اہم ترین کتاب علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) کی ''سیرۃ النبیؐ''(۱۱) ہے۔ اردو زبان میں سیرت کی اس مشہور کتاب کے مصنف، علامہ شبلی نعمانی، انیسویں اور بیسویں صدی کی وہ نامور اور معروف علمی شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی ہمہ جہت دینی وعلمی سرگرمیوں اور وقیع تحقیقی وتنقیدی نگارشات سے اس خطہ کے تہذیبی ورثہ کو مالامال کیا ہے۔ عصرِ حاضر کی علمی و ادبی تاریخ خصوصاً سیرتی ادب کے تذکرہ میں ان کے نام کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ علامہ شبلی کی علمی وفکری تربیت قدیم اور جدید دونوں ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے ان کی تحریروں میں دونوں علمی رویوں کا آہنگ صاف نظر آتا ہے۔ قدیم علوم نے ان کی بنیاد مضبوط کی اور جدید تحقیقی منہاج نے ان کے نقطۂ نظر کو وسعت اور جدت فراہم کی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی نظر میں سیرت کی حیثیت ایک ایسی کتاب کی نہ تھی کہ جس میں تاریخی واقعات واقعہ نگاری کی حیثیت سے درج ہوں۔ ان کا مقصد فنِ سیرت میں ایک ایسی جامع اور محققانہ کتاب لکھنا تھا جس میں رسول اللہ ﷺ کے حالات، واقعات اور کارنامے مستند طریقے پر بیان کیے گئے ہوں اور آپؐ کا پیغام، ہدایت و شریعت اور اسلام کی دعوت وتعلیم، صحیح اور معتبر مآخذ کی مدد سے موجودہ دور کے مذاق کے مطابق بیان کی گئی ہو۔ اس طرح انہوں نے روایات کے انتقاد کا اہتمام کیا اورفنِ سیرت کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔

تالیفِ سیرت کے ضمن میں فاضل مصنف نے جن اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے ان میں سے چند اہم اصول یہ ہیں:

۱۰- خالد مسعود، **فکرِ فراہی اور خدمتِ حدیث**، مجلّہ: فکر ونظر، ستمبر ۲۰۰۵ء، ج ۴۲-۴۳، ص ۲۴۳-۲۵۸۱

۱۱- **سیرت النبیؐ**، (۷ جلد)، لاہور، الفیصل ناشران

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ا- مصدرِ اول۔ قرآنِ حکیم

قرآن حکیم سے ان کی دلچسپی و شغف کے مظاہر ان کی تصانیف و تالیفات سے عیاں ہیں۔ ''سیرت النبیؐ'' اور ''الکلام اور علم الکلام'' میں قرآنی آیات سے استدلال جگہ جگہ موجود ہے اور مولانا شبلی کی قرآن فہمی پر ناطق ہے۔ سیرت کے ان مباحث میں جن کا تعلق صُحفِ بنی اسرائیل اور قرآن پاک سے ہے، وہ اپنے عم زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی سے، جنھوں نے اس قسم کے مسائل پر بہ تحقیق غور کیا تھا، اکثر مشورے کرتے رہتے تھے، جن کا حوالہ مکاتیبِ شبلی میں جابجا موجود ہے(۱۲)۔ اپنے اصولِ تصنیف و ترتیب کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> '' (میں نے) سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے ان کو سب پر مقدم رکھا ہے۔ یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے لیکن لوگوں نے آیات قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی اس لیے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے ہیں''(۱۳)۔

ب- احادیثِ صحیحہ سے استناد

مصنف کی نظر میں:

> ''قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے اور احادیثِ صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں۔ جو واقعات بخاری و مسلم میں مذکور ہیں ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی کوئی ضرورت نہیں، اربابِ سیر کو ایک بڑی غلطی یہ لگی ہے کہ وہ واقعات کو کتبِ حدیث میں، ان موقعوں میں ڈھونڈتے ہیں جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہیے اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کمتر درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں۔ لیکن کتبِ حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں اس لیے اگر عام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو

۱۲- حیاتِ شبلی، ص:۷۱۸

۱۳- سیرت النبیؐ، ج:۱، ص۴۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمام واقعات میں خود صحاحِ ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں۔ ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی روایتوں سے ڈھونڈ کر مہیا کیے جو اہلِ سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے"[۱۴]۔

مزید کہتے ہیں

"بعض واقعات نہایت اہم ہیں ان کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسی مفید معلومات موجود ہیں جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے لیکن سیرت و تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں۔ مثلاً یہ امر کہ جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کا سلسلہ جنابانی کس طرف سے شروع ہوا؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے۔ تمام اربابِ سیر اور مؤرخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے ابتدا کی، لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور واضح تصریح ہے کہ جنگِ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن ابی کو یہ خط لکھا کہ تم نے محمد ﷺ کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے ان کو نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آ کر تمہارا اور محمد ﷺ دونوں کا استیصال کر دیں گے۔"[۱۵] سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

ج-راویانِ سیرت کی تحقیق

علامہ شبلی کے نزدیک (احادیث کی روشنی میں) تاریخی واقعات کی تحقیق اور ان کی صحت و عدم صحت معلوم کرنے کے دو طریقے ہیں: پہلا طریقہ: روایت، یعنی سلسلہ روایت متصل ہو اور تمام رواۃ پر نقد و جرح کی نظر ڈال کر دیکھا جائے کہ وہ سچے ہیں یا جھوٹے، قابلِ اعتبار ہیں یا نا قابل اعتبار۔ دوسرا طریقہ: ان کے نزدیک درایت ہے، یعنی یہ دیکھنا کہ جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے ازروئے عقل صحیح ہے یا نہیں، قیاس و قرینے سے اس کی تصدیق ہو رہی ہے یا تکذیب[۱۶]۔ ابن سعد اور طبری کے بارے میں علامہ شبلی کی رائے یہ ہے کہ ان کے بہت سے رواۃ، ضعیف الروایۃ اور غیر مستند ہیں۔ واقدی ان کی نظر میں کسی طرح قابلِ اعتبار نہیں۔ جبکہ ابن ہشام کے راویوں کو بھی انہوں نے مشکوک قرار دیا ہے۔ اس بنا پر ان کی نظر میں مجموعی

۱۴- ایضاً، ص ۴۷

۱۵- ایضاً، ص ۴۹

۱۶- ایضاً، ص ۴۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ کتبِ حدیث کے ہم پلہ نہیں۔ ان کتب میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتب سے اعتنا نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اُتر جائے وہ حُجت اور استناد کے قابل ہے(۱۷)۔ قبل از بعثت شام کے سفر میں نبی ﷺ کی بحیرا راہب سے ملاقات کے واقعہ پر ان کا تبصرہ اس کی ایک مثال ہے(۱۸)۔

فاضل مصنف نے روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے اور تاامکان کدّ و کاوش کی ہے۔ اس خاص ضرورت کے لیے انھوں نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لیے جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا اور اس طرح سلسلۂ روایت کی تحقیق سے قارئین کو مستفید کیا ہے(۱۹)۔

د- روایات کی عقلی و درایتی معیار پر جانچ پرکھ

علامہ شبلی اسلام کو ایک عقلی مذہب قرار دیتے تھے جس نے عقل کی اہمیت تسلیم کی اور عقائد و اعمال میں عقل سے کام لینے کی ضرورت پر زور دیا(۲۰)۔ علامہ شبلی کی رائے میں واقعاتِ سیرت کو عقلی و درایتی معیارات پر جانچنے پرکھنے کا آغاز متقدمین مؤرخین و محدثین کے دور سے ہی ہو گیا تھا۔ محدثین نے ان تمام معیارات اور پیمانوں کی صراحت کے ساتھ نشان دہی کر دی تھی جس پر ایک روایت یا واقعہ کو پرکھا جائے گا اور ان پیمانوں سے کام بھی لیا۔ جیسے مقدمۂ اوّل میں لکھتے ہیں :

> '' محدثین کا بھی اصول ہے کہ واقعہ جس درجہ کا اہم ہو، شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہیے۔ نوعیتِ واقعہ کی اہمیت کا خیال فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا۔ اسی بنا پر ان کا مذہب ہے کہ جو روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کا راوی فقیہ اور مجتہد ہے یا نہیں،،(۲۱)۔

علامہ شبلی نے ایک اور نکتہ کو بہت اہمیت دی ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے اس میں کس قدر اصل

۱۷- ایضاً، ص ۴۵-۴۶

۱۸- ایضاً، ص ۱۱۹

۱۹- ایضاً، ص ۴۷

۲۰- ملاحظہ ہو: شبلی نعمانی، **الکلام**، ص ۱۹

۲۱- مرجع سابق، ص ۶۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واقعہ ہے اور کس قدر راوی کا قیاس ہے۔ تفحص اور استقراء سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے، وہ اس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں۔ اس کی مثالیں سیرت میں موجود ہیں۔ نبی ﷺ کی اپنی ازواج سے عارضی اور وقتی ناراضگی کو راوی کا طلاق سمجھ لینا اس کی ایک مثال ہے۔

علامہ شبلی نے اس بحث کو نہایت اہم قرار دیا ہے کہ اگر کوئی روایت عقل یا مسلمات یا دیگر قرائن صحیحہ کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہو گی یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں اور سلسلۂ سند متصل ہے۔ انہوں نے چند مثالیں دی ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اکابر صحابہؓ میں ایسے لوگ موجود تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے(۲۲)۔

نیز یہ کہ صحابہؓ اور محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود رہا ہے جو عقلی یا نقلی وجوہ کی بنا پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا گو ان کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوتے تھے۔ چند مزید واقعات لکھ کر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلۂ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اس کے موافق ہیں یا نہیں(۲۳)۔

جیسے مقدمہ میں لکھتے ہیں: ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ''آنحضرت ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ معاف کر دیا تھا اور معافی کی دستاویز لکھوا دی تھی۔'' ملا علی قاری نے اس روایت کو مختلف وجوہ سے باطل قرار دیا ہے:

۱۔ اس معاہدہ پر سعد بن معاذؓ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پا چکے تھے۔

۲۔ دستاویز میں کاتب کا نام معاویہؓ ہے حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے۔

۳۔ اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا۔ جزیہ کا حکم قرآن مجید میں غزوۂ تبوک کے بعد نازل ہوا۔

۴۔ دستاویز میں تحریر ہے کہ یہودیوں سے بے گار نہیں لی جائے گی حالانکہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بے گار کا رواج ہی نہیں تھا۔

۵۔ خیبر والوں نے اسلام کی مخالفت کی تھی۔ ان سے جزیہ معاف کیوں کیا جاتا؟

۶۔ اگر ان سے جزیہ معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے ہوا خواہ، دوست

۲۲۔ ایضاً، ص ۵۹

۲۳۔ ایضاً، ص ۶۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور واجب الرعایۃ ہیں حالاں کہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دیے گئے(۲۴)۔

۵- واقعات کے اسباب وعلل کی بحثیں

علامہ شبلی، یورپین مصنفین کے منہج تاریخ کے زیر اثرِ روایات و واقعات سے نتائج اخذ کرنے اور اس واقعہ میں پوشیدہ مضمرات کے طریق سے آگاہ و آشنا ہو چکے تھے۔ وہ اہم واقعات کو واقعہ نگاری کے انداز میں بیان کرنے کے بعد اس پر ایک تجزیاتی نگاہ ڈالتے ہیں، عام اہل سیر کے بیانات کا جائزہ لیتے ہیں اور قدیم کتبِ مغازی و تاریخ کے بیانات کو بنیاد بنا کر مستشرقین نے جو نتیجہ خیزی کی ہوتی ہے، اس کا منصفانہ جائزہ لیتے ہیں۔ تاریخی تحقیق و تنقید کا انداز ابتداءً انہی یورپین کی تصانیف سے اخذ کیا۔ بعد ازاں اسی اسلوب میں ان کی غلط بیانیوں کا جواب دیا۔ مقدمۂ سیرت میں رقم طراز ہیں:

> ''اربابِ سیر اکثر واقعات کے اسباب وعلل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس باب میں شبہ نہیں ہے کہ اس بارے میں اہلِ مغرب کے مؤرخین کا طریقہ نہایت غیرمعتدل ہے۔ یورپین مؤرخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے اور نہایت دور از کار قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلولات پیدا کرتا ہے۔ اس میں کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مقصد و مطمحِ نظر کو دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتا ہے اور تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے کہ اسلامی مؤرخ نہایت سچائی اور خالص بے طرف داری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب، معتقدات اور تاریخ پر کیا پڑے گا۔ اس کو صرف واقعیت سے غرض ہوتی ہے۔ باقی معاملات اس کے نزدیک بے حیثیت ہوتے ہیں''(۲۵)۔

فاضل مصنف کی نظر میں اسباب و معلولات سے بالکل قطع تعلقی اور عدم توجہی کی بنا پر قارئین بعض اوقات واقعہ سے غیرصحیح نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور مستشرقین ان واقعات کو اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں ابتدائی مؤرخین میں تجزیہ، تعلیل اور تنقید کی کمی نظر آتی ہے، جب کہ غیرمعمولی واقعات اور تاریخ و اعتقادات پر غیرمعمولی اثر ڈالنے والے وقائع کی روایات کا باریک بینی سے

۲۴- ایضاً، ص ۴۵

۲۵- ایضاً، ص ۴۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے(۲۶)۔

فاضل سیرت نگار نے ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر روایاتِ سیرت کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جس کے نتیجے میں کئی واقعات و بیانات نئی شکلوں میں سامنے آئے ہیں، جن کا مختصر جائزہ حسبِ ذیل ہے:

۱- غزوۂ بدر کے اسباب

مفسرین، محدثین اور سیرت نگاروں نے غزوۂ بدر کے اسباب میں اس بات کو اہمیت دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ قریش کے قافلۂ تجارت کو روکنے کے لیے اپنے ساتھیوں کو لے کر نکلے تھے، وہ قافلہ تو بچ نکلا مگر اس کی مدافعت کے لیے جو قریش کا لشکر مکہ سے نکلا تھا، اس سے بدر کے میدان میں مڈبھیڑ ہوگئی اور جنگ برپا ہوگئی(۲۷)۔

علامہ شبلی نے اس کے برعکس یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابتدا ہی سے رسول کریم ﷺ دوسرے لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے، علامہ شبلی نے ''سیرت النبیؐ'' اور ''الفاروق'' دونوں کتابوں میں اس پر بحث کی ہے(۲۸)۔ علامہ شبلی نے اس رائے کو قرآن کی آیات سے مدلل کیا ہے، اس سلسلہ میں علامہ نے ایک اصول یہ بیان کیا ہے کہ ''قرآن مجید میں اگر کسی واقعہ کا صاف ذکر ہے تو اس کے مقابلہ میں کسی روایت اور تاریخ کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔''(۲۹) انہوں نے قرآن کریم کی شہادت کو کافی قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس کے آگے ہم سب کو گردن جھکا دینی چاہیے(۳۰)۔

پھر انہوں نے استدلال میں حسب ذیل آیات کو پیش کیا ہے۔

كما اخرجك ربك من بيتك بالحق... ويقطع دابر الكافرين.(۳۱)

(جس طرح تجھ کو تیرے خدا نے تیرے گھر سے حق پر نکالا درآں حالیکہ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا یہ لوگ حق کے ظاہر ہوتے پیچھے تجھ سے حق بات میں جھگڑا کرتے تھے گویا کہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے

۲۶- ایضاً، ص ۴۷

۲۷- ایضاً، ۱۹۵-۱۹۸

۲۸- شبلی نعمانی، **الفاروق**، اعظم گڑھ، معارف پریس، ص ۲۸-۴۱

۲۹- مرجع سابق، ص ۲۰۰

۳۰- ایضاً، ص ۲۰۱

۳۱- الانفال: ۵-۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں اور موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور جب کہ خدا تم سے وعدہ کرتا تھا کہ دو جماعتوں میں کوئی جماعت تم کو ہاتھ آئے گی۔ اور تم یہ چاہتے تھے کہ بے کھٹکے والی جماعت تم کو ہاتھ آجائے اور اللہ یہ چاہتا تھا کہ حق کو اپنی باتوں سے قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے)۔

اپنے استدلال کو مبرہن کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ ترکیبِ نحوی کی رو سے ''وانّ'' میں جو واؤ ہے، حالیہ ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے، یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپؐ مدینہ سے نکل رہے تھے، نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے۔ کیوں کہ واؤ حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چُرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے۔

۲۔ آیتِ مذکورہ میں بتصریح مذکور ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے۔ ایک کاروانِ تجارت اور ایک قریش کی فوج جو مکہ سے آرہی تھی۔ اربابِ سیر کہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے جب آنحضرت ﷺ بدر کے قریب پہنچ چکے تھے، لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروانِ تجارت صحیح سلامت بچ کر نکل گیا تھا اس وقت یہ کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ دونوں میں ایک کا وعدہ ہے۔ اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا چاہیے جب دونوں گروہ کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو۔ الخ

۳۔ سب سے قابل لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید کی آیت مذکور بالا میں کفار کے دو فریق کا خدا نے بیان کیا ہے کہ ایک قافلۂ تجارت اور دوسرا صاحبِ شوکت یعنی کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے آرہے تھے، آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروانِ تجارت پر حملہ کیا جائے۔ خدا تعالیٰ نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی: **وتودون ان غیر ذات الشوکة تکون لکم و یرید اللہ ان یحق الحق بکلمته ویقطع دابر الکافرین** (اور تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت تمہارے ہاتھ آجائے، اور اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا ثابت کر دے، اور ان کافروں کی جڑ کاٹ دے) ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے جو چاہتا ہے کہ حق کو قائم کر دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہو گا۔ میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔

۴۔ واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ سے اس سروسامان کے ساتھ نکل رہے ہیں کہ تین سو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے زیادہ جانباز مہاجر و انصار ساتھ ہیں۔ ان میں فاتح خیبرؓ اور حضرت امیر حمزہؓ بھی ہیں جس میں ہر ایک بجائے خود ایک لشکر ہے باوجود اس کے (جیسا کہ قرآن مجید میں بتصریح مذکور ہے) ڈر کے مارے کچھ صحابہؓ کا دل بیٹھا جاتا ہے اور ان کو نظر آتا ہے کہ کوئی ان کو موت کے منہ میں لیے جاتا ہے۔ اگر صرف قافلۂ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ خوف، یہ اضطراب کس بنا پر تھا؟ قرآن مجید میں ایک اور آیت اسی بدر کے متعلق نازل ہوئی ہے اور اس وقت جب آپؐ مدینہ ہی میں تشریف رکھتے تھے۔ وہ آیت تھی: لا یستوی القاعدون من المؤمنین غیر اولی الضرر... الخ [۳۲] (اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مومن اور بغیر عذر کے بیٹھ رہنے والے مومن برابر نہیں۔ اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے درجوں میں بہت فضیلت دے رکھی ہے، اور یوں اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خوبی اور اچھائی کا وعدہ دیا ہے)۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے ''غیر اولی الضرر'' کا جملہ نہ تھا۔ یہ آیت سن کر حضرت عبداللہ بن مکتومؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اندھے پن کا عُذر کیا۔ اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا: غیر اولی الضرر یعنی معذوروں کے سوا۔ یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔ کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے تھے ان کی نسبت قرآن مجید میں ہے۔

> ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطراً ورباء الناس
> ویصدون عن سبیل اللہ۔ [۳۳]
> (اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور خدا
> کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے)

اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا یہ کیوں کہتا کہ وہ اظہارِ شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے؟ [۳۴]۔

علامہ شبلی نعمانی نے قرآنی آیت سے جو استدلال کیا ہے اسے بعض مفسرین اور سیرت نگاروں نے قرآنی اشارات اور حدیث کی صراحتوں کے خلاف قرار دے کر رد کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ شبیر احمد عثمانی اپنی

۳۲- النساء: ۹۵

۳۳- الانفال: ۴۷

۳۴- سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۲۱۰-۲۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تفسیر میں لکھتے ہیں:

''جن لوگوں کا خیال ہے کہ اس سفر میں حضورؐ شروع ہی سے فوجی لشکر کے مقابلہ میں نکلے تھے جو مدینہ پر از خود اقدام کرتا ہوا چلا آرہا تھا، تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کی نیت آپؐ نے اول سے آخر تک کسی وقت نہیں کی وہ فی الحقیقت اپنے ایک خود ساختہ اصول پر تمام ذخیرۂ حدیث و سیر اور اشاراتِ قرآنیہ کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔''(۳۵)

تاہم کسی حلقہ کی طرف سے علامہ شبلی کے بیان کیے گئے نکات کے معقول جوابات نہیں دیے گئے۔

۲-اسیرانِ بدر سے فدیہ لینے پر عتاب

سورہ انفال میں جنگِ بدر کے قیدیوں اور مالِ غنیمت سے متعلق ارشاد ہے:﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (۳۶) (کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور حکیم ہے، اگر اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے اس کی پاداش میں تم کو بڑی سزا دی جاتی)۔

عام طور پر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ عتاب جنگ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینے کے بارے میں نازل ہوا تھا، صحابہؓ میں حضرت عمرؓ وغیرہ کی رائے تھی کہ ان قیدیوں کو قتل کر دیا جائے تاکہ کفار مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کرسکیں، جب کہ حضرت ابو بکرؓ وغیرہ کی رائے تھی کہ یہ اپنے ہی بھائی بندے ہیں ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضورﷺ کے پیشِ نظر انسانی ہمدردی تھی جب کہ صحابہؓ کے پیشِ نظر مالی منفعت یعنی فدیہ کا حصول تھا۔ صحابہؓ کی یہ ایک اجتہادی غلطی قرار دی گئی اور بعض لوگوں نے زیادہ تر مالی فوائد پر نظر کر کے مشورہ دیا تھا، ان کو صاف طور پر تریدون عرض الدنیا سے خطاب کیا گیا(۳۷)۔

علامہ شبلی نعمانی اس بات سے تو اتفاق کرتے ہیں کہ عتاب فدیہ لینے پر تھا، البتہ اسیرانِ بدر کو قتل نہ کرنے سے عتاب کا تعلق نہیں تھا۔ ''الفاروق'' میں بھی یہ بحث موجود ہے۔ لیکن ہم یہاں ''سیرت النبیؐ'' کی

۳۵- شبیر احمد عثمانی، حاشیہ ترجمہ شیخ الہند، سورۃ الانفال، مطبوعہ الملک فہد، ص:۲۳۵

۳۶- الانفال: ۶۱-۶۸

۳۷- عثمانی، حاشیہ ترجمہ شیخ الہند، الانفال: ۶۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عبارت نقل کرتے ہیں۔

"صحیح مسلم اور ترمذی دونوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عتاب فدیہ لینے یا مال غنیمت لوٹنے پر تھا۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ جب عتاب کی آیت نازل ہوئی تو آپؐ رونے لگے اور جب حضرت عمرؓ نے سبب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: ابکی الذی عرض علی اصحابك من اخذهم الفداء۔ یعنی تمہارے ساتھیوں نے فدیہ لیا اس پر جو خدا کی طرف سے پیش کیا گیا اس پر میں رو رہا ہوں۔ عموماً لوگوں نے غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ عتاب اس پر آیا کہ اسیرانِ جنگ کو قتل کیوں نہیں کر ڈالا۔ چنانچہ لوگوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ ما کان لنبی ان یکون له اسری حتی یثخن فی الارض۔ لیکن اس آیت کا صرف یہ ماحصل ہے کہ میدانِ جنگ میں جب تک کافی خون ریزی نہ ہو چکے قیدی بنانا مناسب نہیں۔ اس سے یہ کیوں کر ثابت ہو سکتا ہے کہ اگر خون ریزی سے پہلے گرفتار کر لیے گئے تو لڑائی کے بعد بھی وہ قتل کیے جا سکتے ہیں[۳۸]۔

۳۔ شراب کی حرمت کا زمانۂ نزول

شراب کی حرمت کا قطعی حکم قرآن کریم میں اس طرح مذکور ہے۔

﴿يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ. اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ وَ يَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ.﴾[۳۹]

(مسلمانو! بے شک شراب اور جوا اور بت اور قمار کے تیر ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں تو تم اس سے باز آؤ کہ تم کو فلاح حاصل ہو۔ شیطان تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تم لوگوں میں شراب اور جوئے کے ذریعے دشمنی اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد اور نماز سے روک

۳۸- مرجع سابق، ص ۲۰۴

۳۹- المائدہ: ۹۰-۹۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دے تو بولو: تم باز آتے ہو)۔

حافظ ابن حجر نے اس آیت کا زمانۂ نزول ۸ھ یعنی فتح مکہ کا سال قرار دیا ہے[۴۰]۔ علامہ شبلی نے حافظ ابن حجر کے اس قول سے اختلاف کیا ہے اور مسند احمد کی روایت سے ان کے استدلال کو صحیح نہیں قرار دیا ہے۔ فاضل سیرت نگار لکھتے ہیں:

> ''ہماری رائے میں حافظ ابن حجر کا خیال اور استدلال صحیح نہیں، اس روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان صاحب کو شراب کی حرمت کا حال فتح مکہ تک نہیں معلوم ہوتا تھا۔ یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت حرمت نازل بھی نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے احکام ہیں جن کی خبر دور کے رہنے والوں کو بہت دیر کے بعد ہوئی، علاوہ اس کے خود بعض روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے شراب کی حرمت نازل ہو چکی تھی۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ شراب جیسی ناپاک چیز ۸ھ تک حلال رہتی اور آنحضرت ﷺ کی وفات سے صرف دو برس پہلے حرام ہوئی۔ حقیقت میں شراب ہجرت کے تیسرے یا چوتھے برس حرام ہو چکی تھی''[۴۱]۔

علامہ شبلی نے اس سے پہلے شراب کی حرمت کا سال ۵ھ لکھا ہے[۴۲]۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے حرمتِ شراب سے متعلق روایتوں پر تبصرہ کرنے کے بعد بطورِ نتیجہ لکھا ہے: ''شراب کی حرمت کا واقعہ جنگ احد سے متصل تھا''[۴۳]۔ مولانا ادریس کاندھلوی نے ابن اسحاق کے حوالہ سے ۴ھ کو حرمتِ شراب کا سال قرار دیا ہے[۴۴]۔

۴۔ واقعہ تحریم ازواج

بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ماریہؓ قبطیہ باندی کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ چنانچہ امام نسائی نے حضرت انس بن مالکؓ کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ کے پاس شب باشی

۴۰۔ ابن حجر، فتح الباری، کتاب التفسیر، باب لیس علی الذین امنوا، رقم الحدیث: ۴۶۲۰

۴۱۔ سیرت النبیؐ، ج ۲، ص ۱۴۴-۱۴۵

۴۲۔ ایضاً، ص ۸۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۸۰ حاشیہ

۴۴۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرت المصطفیٰؐ، ج ۲، ص ۲۷۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے ایک باندی تھی جسے آپؐ نے حضرت عائشہؓ و حفصہؓ کی وجہ سے حرام کر لیا تھا(۴۵)۔

تاہم صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ کے حوالے سے یہ روایت مذکور ہے کہ حضرت زینب بنت جحشؓ کے پاس حضورؐ شہد نوش فرمایا کرتے تھے اور وہاں ٹھہرتے تھے تو حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ نے یہ طے کیا کہ جب آپؐ وہاں تشریف لائیں تو ہم کہیں گے کہ آپؐ نے مغافیر کھایا ہے۔ آپؐ کے منہ سے مغافیر کی بُو آ رہی ہے۔ چنانچہ جب آپؐ تشریف لائے تو ان میں سے کسی نے کہا کہ آپؐ نے مغافیر کھایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نہیں، میں نے زینب کے پاس شہد کھایا ہے۔ آئندہ میں نہیں کھاؤں گا۔ اس پر مذکورہ آیات نازل ہوئیں(۴۶)۔

حافظ ابن کثیر نے اسی روایت کو صحیح قرار دیا ہے(۴۷)۔ علامہ شبلی نعمانی نے کتبِ حدیث وتفسیر میں وارد اس سلسلہ کی مرویات کا تجزیہ کیا ہے اور ماریہؓ قبطیہ کے حرام کر لینے کی جو روایت آئی ہے اس پر روایت و درایت دونوں نقطۂ نظر سے بحث کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کسی طرح بھی قابلِ اعتنا اور لائقِ توجہ نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ امر مسلم ہے کہ ماریہؓ کی روایت صحاح ستہ کی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ یہ بھی تسلیم ہے کہ سورہ تحریم کا شانِ نزول جو صحیح بخاری اور مسلم میں مذکور ہے (یعنی شہد کا واقعہ) قطعی طریقہ سے ثابت ہے، امام نووی نے جو ائمہ محدثین میں سے ہیں، صاف تصریح کی ہے کہ ماریہؓ کے باب میں کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر اور ابن کثیر نے جن طریقوں کو صحیح کہا ان میں سے ایک منقطع اور دوسرے کا راوی کثیرالخطا ہے، ان واقعات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ روایت استفسار کے قابل ہے۔ یہ بحث اصولِ روایت کی بنا پر تھی۔ درایت کا لحاظ کیا جائے تو مطلق کدّ و کاوش کی حاجت نہیں، جو رکیک واقعہ ان روایتوں میں بیان کیا گیا ہے اور خصوصاً طبری وغیرہ میں جو جزئیات مذکور ہیں وہ ایک معمولی آدمی کی طرف منسوب نہیں کیے جا سکتے، نہ کہ اس ذات پاک کی طرف، جو تقدس و نزاہت کا پیکر تھا''(۴۸)۔

۴۵- ابن کثیر، **تفسیر القرآن العظیم**، دمشق، دارالخیر، ج ۲، ص ۴۷

۴۶- بخاری، **کتاب الایمان والنذور، باب اذا حرم طعامه**، رقم: ۶۱۹۷

۴۷- ابن کثیر، **تفسیر القرآن العظیم**، ج ۲، ص ۳۱۸

۴۸- **سیرت النبیؐ**، ج ۱، ص ۲۱۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵- ایلا، تخییر، مظاہر ازواج کے واقعات

علامہ شبلی کا ان واقعات کے بارے میں نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ واقعات ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ صحیح بخاری ''کتاب النکاح'' میں ابن عباس کی زبانی جو نہایت تفصیلی روایت ہے اس میں صاف تصریح ہے کہ مظاہرہ ازواج مطہرات سے انعزالی،افشائے راز، آیتِ تخییر کا نزول سب ایک ہی سلسلہ کے واقعات ہیں(۴۹)۔

۶-غرانیق العلیٰ کی تحقیق

بعض کتبِ تفسیر و سیرت کے حوالہ سے نبی کریمﷺ کی مکی زندگی سے متعلق ایک گمراہ کن واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ رسول پاکﷺ ایک مرتبہ حرم پاک میں نماز ادا کر رہے تھے، وہاں کفار بھی موجود تھے۔ جب آپؐ نے مذکورہ آیت پڑھی تو شیطان نے آپؐ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیے: تلک الغرانیق العلیٰ ان شفاعتھن لترتجیٰ (یہ بت معظم و محترم ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہے)۔ اس کے بعد آنحضرتﷺ نے سجدہ کیا اور تمام کفار نے آپؐ کے ساتھ سجدہ کیا۔ صحیح بخاری میں واقعہ کی نوعیت صرف اتنی ہے کہ بروایت ابن عباسؓ سورۃ النجم کی آیت پرسجدہ کیا تو آپؐ کے ساتھ مسلمانوں، مشرکوں اور جن و انس نے سجدہ کیا(۵۰)۔

علامہ شبلی نے واقعہ کا اتنا حصہ تسلیم کیا ہے جتنا کہ بخاری میں مذکور ہے باقی القاء شیطان کی جو وضاحت کی ہے وہ بہت اہم اور عقل کو اپیل کرتی ہے، علامہ نے کفار کی دو عادتیں نقل کی ہیں۔ اوّل: جب آنحضرتﷺ قرآن کی تلاوت کرتے تو شور مچاتے اور اپنی طرف سے فقرے ملاد یتے۔ دوم: قریش کا معمول تھا کہ جب کعبہ کا طواف کرتے تو یہ فقرے کہتے جاتے:

والـلات والعزی ومناۃ الثالثۃ الاخری. فانھن الغرانیق العلٰی وان شفاعتھن لترتجیٰ (لات و عزیٰ اور تیسرے بُت منات کی قسم یہ بلند و بزرگ ہیں)۔

فاضل سیرت نگار نے ان دونوں عادتوں کے ضمن میں یہ استدلال کیا ہے:

> ''آنحضرتﷺ نے جب سورہ النجم کی وہ آیتیں پڑھیں تو کسی شیطان (کافر) نے یہی فقرے آپؐ کی آواز میں ملا کر پڑھ دیے ہوں گے، دور کے

۴۹- ایضاً، ص۳۱۴

۵۰- بخاریؒ، کتاب التفسیر، باب فاسجدوا للہ واعبدوہ، رقم ۴۴۸۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں کو (کفار میں سے) شبہ ہوا ہو گا کہ آنحضرت ﷺ نے ہی وہ الفاظ ادا کیے۔ اس واقعہ کا چرچا جب مسلمانوں میں ہوا ہو گا تو لوگوں نے کہا ہو گا کہ کسی شیطان نے آپؐ کی طرف سے وہ فقرے کہلائے ہوں گے۔ اس واقعہ نے روایتوں میں صورت بدل بدل کر یہ صورت اختیار کر لی کہ شیطان نے آنخضرت ﷺ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیے، اور چونکہ عام مسلمان اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شیطان دوسرے شخص کی زبان سے بول سکتا ہے۔ اس لیے راویوں نے اس روایت کو تسلیم کر لیا[۵۱]۔ علامہ شبلی نے علامہ زرقانی کی "المواہب الدنیہ" کی عبارت اپنی اس توجیہ کے حق میں پیش کی ہے۔

۷- جنگِ احزاب کے موقع پر فرشتوں کے لشکر کی آمد

جنگِ احزاب کے موقع پر جب دشمن حملہ آوروں نے مدینہ کا محاصرہ کر رکھا تھا اس وقت اللہ تعالیٰ نے آندھی بھیج کر دشمن فوجوں کو منتشر کر دیا۔ اس موقع کے متعلق قرآن میں وارد ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا.﴾[۵۲]

(مسلمانو! خدا کے اس احسان کو یاد کرو جب تم پر فوجیں آ پڑیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور فوجیں بھیجیں جو تم کو دکھائی نہیں دیتی تھیں)

مذکورہ آیت میں آندھی کا مطلب واضح ہے مگر نہ دکھائی دینے والی فوجوں کا مطلب کیا ہے؟ قدیم مفسرین نے اس سے مراد فرشتوں کی جماعت لیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

هم الملٰئكة زلزلتهم والقت فی قلوبهم الرعب والخوف.[۵۳]

(یعنی وہ فرشتے تھے جنہوں نے کفار کے قدم اکھاڑ دیے اور ان کے دلوں میں رعب اور خوف پیدا کر دیا)

علامہ شبلی نعمانی نے ان مخفی فوجوں سے مراد اسی طوفانی ہوا کو قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"محاصرہ جس قدر طویل ہوتا جاتا تھا محاصرہ کرنے والے ہمت ہارتے

۵۱- سیرت النبیؐ، ج ۱، ص ۱۴۷

۵۲- الاحزاب: ۹

۵۳- ابنِ کثیر، ج ۳، ص ۵۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جاتے تھے۔ دس ہزار آدمیوں کو رسد پہنچانا آسان کام نہ تھا، پھر باوجود سردی کے موسم کے اس زور کی ہوا چلی کہ طوفان آ گیا۔ خیموں کی طنابیں اکھڑ اکھڑ گئیں، کھانے کے دیگچے چولہے پر الٹ الٹ جاتے تھے، اس واقعے نے فوجوں سے بڑھ کر کام دیا۔ اسی بنا پر قرآن مجید نے بادِ صرصر کو عسکر ہی سے تعبیر کیا ہے“[۵۴]۔

”پیغمبرِ انسانیت“ از محمد جعفر شاہ پھلواری

مقالہ ہذا کی دوسری زیرِ بحث کتاب کا نام ”پیغمبر انسانیت“[۵۵] ہے، جس کے مؤلف محمد جعفر شاہ پھلواری ہیں۔ فاضل مصنف ایک طویل عرصہ تک ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے وابستہ رہے اور مختلف موضوعات پر دینی نقطۂ نظر سے دادِ تحقیق دی۔ آپ کے والد شاہ محمد سلیمان پھلواری، علامہ عبدالحئیؒ لکھنوی اور سید نذیر حسین محدث دہلوی کے تلامذہ اور علامہ شبلی اور علامہ فراہی کے ہم عصروں میں سے تھے۔ انہیں علومِ عقلیہ و نقلیہ میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ سیرت کے موضوع پر ان کی کوئی مستقل کتاب نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی تحقیق و جستجو اور بیانات کو ان کے صاحبزادے اور فاضل مصنف کے بھائی حسن میاں پھلواری نے مرتب کیا ہے۔ کتاب ”پیغمبرِ انسانیت“ کے مصنف اپنے والد کی سیرت نگاری کے بارے میں کہتے ہیں کہ: ”ان کے وعظ و بیانِ سیرت کی خوبی ہوتی تھی کہ وہ تاریخی روایات کے محض حوالے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ جابجا ان پر قرآن، عقل و درایت، رجال، اصولِ جرح و تعدیل اور معیارِ سیرت کے نقطۂ نگاہ سے تبصرہ اور تنقید کرتے تھے“[۵۶]۔

جعفر شاہ پھلواری نے اپنے والد کے انہی اصولوں کو ”پیغمبرِ انسانیت“ میں برتا ہے۔ فاضل سیرت نگار نے سیرت کے واقعات و بیانات پر تدبر و تعقل کی نگاہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ مختلف حلقوں کی طرف سے وارد ہونے والے شبہات و اعتراضات کا معقول تجزیہ کیا ہے اور عقلی انداز میں غور و فکر کرنے کا عمدہ نمونہ فراہم کیا ہے۔ چند مثالیں ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

۵۴- **سیرت النبیؐ**، ج ۱، ص ۲۴۵

۵۵- **پیغمبرِ انسانیتؐ**، لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۸۴ء، (صفحات: ۴۵۲)

۵۶- ایضاً، مقدمہ، ص ۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱-تبلیغ کے ابتدائی دور میں اخفائے حال

سیرتِ طیبہ پر بحث کرتے ہوئے تبلیغ کے ابتدائی دور میں اخفائے حال کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''سارے سیرت نگاروں کا کہنا ہے کہ تبلیغ دین تین سال تک خفیہ ہوتی رہی جس کا مرکز دار ارقم بن ابی ارقم تھا۔ اہل اسلام اپنی نمازیں بھی پہاڑی گھاٹیوں میں یا دوسرے پوشیدہ مقامات میں ادا کرتے تھے۔ خفیہ تبلیغ کے متعلق سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا یہ انداز اہل کفر کے خوف یا اہل اسلام کی بزدلی پر مبنی تھا؟ شجاعت و مردانگی اور حق پرستی کا تو یہ تقاضا ہونا چاہیے تھا کہ اول روز ہی سے اعلان حق کر دیا جاتا اور کسی طاقت سے کوئی خوف نہ ہوتا خواہ نتیجہ کچھ بھی ہوتا۔ ظاہراً تو صورتِ حال ایسی ہی نظر آتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اندازِ خفا مبنی برخوف نہ تھا بلکہ تقاضائے حکمت تھا۔ زندگی میں بے شمار مراحل ایسے آتے ہیں جب دو قدروں کا باہم ٹکراؤ ہو جاتا ہے اور وہ ایسا موقع ہوتا ہے کہ کسی ایک کو مقدم اور دوسرے کو مؤخر کرنا پڑتا ہے اور اسی تقدیم و تاخیر میں انسانی عقل وفراست امتحان میں پڑجاتی ہے۔ حضورؐ کی سیرت نے ان دو خیروں، جرأت مندانہ اعلان اور حکیمانہ پوشیدگی، میں انفع و اصلح کو اختیار فرمایا۔ اظہارِ شجاعت کا موقع ہر وقت نہیں ہوتا(۵۷)۔

اسی طرح اہل یہود کی عداوت کے اسباب، اور مدینہ میں قتال کی اجازت کے ضمن میں بھی عمدہ استدلال کیا ہے۔ قرآن حکیم اور عقلی متدلات سے اپنے بیان کو پرزور کیا ہے۔

۲-غزوۂ بدر کے اسباب میں قافلۂ ابوسفیان کی اہمیت

غزوۂ بدر میں قافلۂ ابوسفیان کے ضمن میں لمحۂ فکریہ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔ ابن اسحاق نے عبداللہ بن عباسؓ کی زبانی لکھا ہے کہ جب حضورؐ کو اس قافلۂ تجارت کی اطلاع ملی تو حضورؐ نے فرمایا:

هذا عير قريش فيها اموالهم فاخرجوا اليها لعل الله ينفلكموها.

۵۷- ایضاً، ص ۳۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(دیکھو قریش کا قافلہ مال سے لدا جارہا ہے۔ تم ادھر جاؤ شاید اللہ تعالیٰ تمہیں یہ مال غنیمت دلوائے)

گویا نعوذ باللہ خود حضورؐ کی خواہش تھی کہ قافلہ بغیر کسی اعلانِ جنگ کے لوٹ لیا جائے اور اس طرح پچھلے مظالم کا انتقام لیا جائے۔ ایسی ادنیٰ خواہش اس رسول کے دل میں کب پیدا ہوسکتی ہے جس کی بعثت کا مقصد ہی اعلیٰ اقدار کا قیام اور مکارم اخلاق کی تخلیق (وتکمیل) ہو اور جس کے اعلیٰ اخلاق کی شہادت انک لعلیٰ خلقٍ عظیم کا خداوندی ارشاد دے رہا ہو۔ حضورؐ تو ایسے پست جذبات کو ختم کرنے آئے تھے نہ کہ انہیں باقی رکھنے کے لیے، البتہ بعض صحابہؓ کے دل میں اس خیال کا آنا ایک بشری تقاضا تھا بعد ازاں اس خیال کے آنے کی وجوہات بیان کی ہیں (۵۸)۔

اگر واقعی حضورؐ کی یہ مرضی ہوتی کہ مکّے سے تمام جانے والے تجارتی قافلوں کو روک کر لوٹ لیا جائے تو ہجرت کے بعد قریش کا ایک قافلہ بھی نہ بچ سکتا تھا اس لیے کہ مکّے اور شام والی سڑک مدینے سے کچھ دور نہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ حضورؐ نے کبھی اجازت نہ دی۔ حضورؐ نہ تو بے مقصد جذبۂ انتقام کی پرورش چاہتے تھے اور نہ لوٹ مار جیسے پست مقصد سے اعلیٰ اسلامی اقدار کو مجروح کرانا پسند فرماتے تھے۔
اس وقت حضورؐ کے سامنے دو چیزیں تھیں۔

ایک طرف مسلمانوں کی مارشل اسپرٹ تھی جسے آگے چل کر اعلیٰ اقدار کی محافظت کے لیے وقف ہونا تھا۔ اس اسپرٹ کو دبا کر ختم کرنا کسی صاحبِ عقل کے نزدیک درست نہیں ہوسکتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس دباؤ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو جائیں۔ دوسری طرف یہ خطرہ تھا کہ اگر ان مسلمانوں کو مارچ کا حکم دے دیا جائے تو یہ کوئی اعلیٰ مقصد نہ ہو گا، محض جذبۂ انتقام ہو گا۔ نیز اسلامی اقدارِ جنگ کے بھی خلاف ہو گا۔ یعنی دشمن حملہ آور نہیں ہوتا، مٹھی بھر بے طاقت جماعت ہے اور وہ بھی قافلہ تجارت کی شکل میں۔ یہ کوئی شجاعت نہیں کہ کسی کو کمزور پا کر دبا دیا جائے اور وہ بھی کسی اعلیٰ مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض لوٹ مار کے لیے (۵۹)۔

۵۸- ایضاً، ص ۲۱۲-۲۱۳

۵۹- ایضاً، ص ۲۱۴، ۲۱۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غرض یہ کہ فاضل سیرت نگار کی نظر میں یہ دونوں اقدام نامناسب تھے۔ اس لیے حضورؐ نے ایک ایسی راہ اختیار فرمائی کہ یہ حملہ بھی نہ ہو اور مسلمانوں کے جذبات بھی مجروح نہ ہوں یعنی مارشل اسپرٹ کو آئندہ کے لیے محفوظ رکھا جائے اور اس قافلہ تجارت سے مڈبھیڑ ہونے کا موقع ٹال دیا جائے۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنی عدیم النظیر بصیرت سے یہی کچھ کیا۔ وہ اس طرح کہ کچھ وقت مشورے میں صرف کیا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے جذبات حملے کے حق میں ہیں تو کچھ مزید وقت اس لیے لے لیا کہ مزید حالات معلوم کر لیے جائیں۔ پھر دو شخصوں (طلحہ بن عبداللہؓ اور سعد بن زیدؓ) کو خبر لانے کے لیے بھیجا۔ اس جنگ کو ٹالنے کی یہ بڑی اعلیٰ درجے کی حکیمانہ تدبیر تھی۔ چنانچہ اسی مشورے اور تگ و دو میں ابو سفیان کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ دریا کے کنارے کا راستہ اختیار کر کے صاف بچ نکلا۔ یہی مقصد تھا جسے حضورؐ نے ایسی خوبصورتی سے پورا فرمایا کہ مسلمانوں کو ایک پست مقصد یعنی تسکینِ انتقام اور غیر شجاعانہ جنگ اور لوٹ مار سے بھی بچا لیا، اور قوت قتال کو ایک دوسرے اہم موقع ''بدر'' کے لیے بھی محفوظ کر دیا(۶۰)۔

فاضل مصنف اس موقع پر کہتے ہیں کہ ہمیں قرآن پاک سے بھی کچھ اسی قسم کا اشارہ ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

﴿وَ اِذْ یَعِدُکُمُ اللّٰہُ اِحْدَی الطَّآئِفَتَیْنِ اَنَّھَا لَکُمْ وَ تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَۃِ تَکُوْنُ لَکُمْ وَ یُرِیْدُ اللّٰہُ اَنْ یُّحِقَّ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَ یَقْطَعَ دَابِرَ الْکٰفِرِیْنَ.﴾(۶۱)

(اور وہ وقت یاد کرو جب اللہ تم سے ان دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمہارے لیے مقدر ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ کمزور ہی جماعت ہمارے لیے ہو حالانکہ اللہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے کلمات سے حق کو حق ثابت کر کے ان کی جڑیں کاٹ دے)۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے وعدہ فرمایا تھا کہ دو گروہوں میں سے ایک پر مسلمانوں کو

۶۰- ایضاً، ص ۲۱۶

۶۱- الانفال: ۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قابو حاصل ہو گا۔ ایک طاقتور گروہ تھا اور دوسرا کمزور۔ اس کی تفسیر اب تک یہی کی جاتی ہے کہ ایک معرکۂ بدر تھا اور دوسرا یہ تجارتی قافلہ اور اس تفسیر کے علاوہ کوئی دوسری تفسیر ہمارے سامنے نہیں آئی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کی فطری خواہش یہی تھی کہ کمزور گروہ (قافلہ تجارت) ہی ان کے قبضے میں آجائے، کیوں کہ مقابلہ بھی آسان تھا اور مال غنیمت کی فراوانی بھی تھی۔ لیکن اللہ کی اور اللہ کے رسول کی بھی خواہش یہ تھی کہ قافلۂ تجارت کی بجائے اس گروہ کا مقابلہ ہو (یعنی محاربینِ بدر کا) جس کے بعد باطل و کفر کا زور ٹوٹ جائے۔ یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ کی بھی وہی خواہش تھی جو عام مسلمانوں کی تھی۔ یا خود رسول اللہ ﷺ ہی نے مسلمانوں کو قافلۂ تجارت لوٹنے پر ابھارا تھا، ہمارے خیال میں روحِ قرآنی، سیرتِ رسول اور مقاصدِ اسلامیہ کے مطابق نہیں ہے[۶۲]۔ بدر کے تمام مراحل پر قرآن حکیم کے بیانات کی روشنی میں تبصرہ و تجزیہ کیا ہے۔ جس سے واقعات کی دلچسپ منظر کشی ہوتی ہے[۶۳]۔

۳- سیرتِ نبویؐ سے جہیز پر استدلال کی بحث

تزویج فاطمہؓ کے ضمن میں ''جہیز کی غلط فہمی کی وجہ'' کے تحت لکھتے ہیں:

''بہت عرصہ ہوا ایک بار ندوۃ العلما لکھنؤ میں ایک بڑے وسیع النظر استاد مولانا شاہ حلیم عطا سلونی سے جہیز فاطمہؓ پر گفتگو ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ بیہقی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ: **جهز رسول الله صلى الله عليه وسلم فاطمة فى خميل.... الخ** ۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے ''جہیز'' دیا اور یہی جهز لفظ دوسری روایتوں میں چاندی کے ہار کے متعلق بھی ہے۔ اس لیے جہیز کے وجود سے انکار کیسے ممکن ہے؟ میں نے عرض کیا کہ سورہ یوسف میں ہے:

فلما جهزهم بجهازهم.... الخ[۶۴] (جب (یوسف نے) انہیں ان کا اسباب مہیا کر دیا تو کہا کہ تم میرے پاس اپنے اس بھائی کو لانا جو تمہارے باپ سے ہے)۔

تو کیا آپ اس کا ترجمہ یوں کریں گے کہ ''جب یوسف نے اپنے بھائیوں کو جہیز دیا''۔ تجہیز کے معنی ہیں سامان مہیا کرنا نہ کہ جہیز دینا۔ روایت میں **جهز** کا لفظ آیا ہے اس کے معنیٰ صرف یہ ہیں کہ حضورؐ نے فاطمہؓ کو یہ سامان دیے نہ کہ یہ سامان ''جہیز'' میں دیے۔ سامان خواہ آپ کسی مسافر کے لیے کریں یا کسی دلہن کے لیے یا کسی میت کے لیے **جهز** کا لفظ سب کے لیے آتا ہے۔ اصطلاح ''جہیز'' کا مفہوم اس سے بالکل

۶۲- **پیغمبرِ انسانیت**، ص ۲۱۶

۶۳- ایضاً، ص، ۲۳۴-۲۳۶

۶۴- یوسف: ۵۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جداگانہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حضورؐ نے جناب فاطمہؓ کو کچھ بھی نہیں دیا۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا حضورؐ نے جہیز دیا؟ اور اس ''دینے'' سے جہیز دینے کو سنت نبوی قرار دیا جاسکتا ہے؟ مولانا سید سلیمان ندوی نے بھی اس تجہیز کو اصطلاحی جہیز ہی لکھا ہے۔ جو میرے خیال میں صحیح نہیں۔ اس رسمِ ہنود کو سنتِ نبویہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا اور اس میں اتنا غلو پیدا ہوگیا کہ اس کی پابندی میں گھل گھل کر مرنا رہ گیا اور جس فرض کا قرآن، حدیث اور فقہ میں ہر جگہ ذکر ہے وہ محض رسم بن کر رہ گیا۔ وہ فرض ہے، مہر یا صِداق و صدقات یا اجر یا فریضہ جسے محض ایک رسم یا مذاق بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور جو چیز سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اسے لازمۂ ازواج بنا دیا گیا، اور لازمہ بھی ایسا کہ گویا یہ سنت مؤکدہ سے کم نہیں(۶۵)۔

۴۔ حضرت جویریہؓ کا اُم المؤمنین بننا

غزوۂ بنی المصطلق (۵ھ) کے بعد بنی مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی حضرت جویریہؓ کا ازخود حضورؐ کی زوجیت میں آنے پر راضی ہونے (اہلِ سیر) کے بیان پر مستشرقین نے بہت ناک بھوں چڑھائی۔ فاضل مصنف نے اس کا بہت معقول جواب دیا ہے۔ ان کی نظر میں (حضرت جویریہؓ کا راضی ہونا) بہت قرینِ قیاس ہے۔ ایک طرف وہ اپنے باپ کو دیکھ چکی تھی کہ اپنی جمعیت سمیت بھاگ نکلا اور بیٹی کو گرفتاری کے لیے چھوڑ گیا۔ دوسری طرف وہ مسلمانوں کے اعلیٰ کردار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں کہ ان میں سے ہر فرد تقویٰ، اخلاق، خداپرستی کا زندہ پیکر ہے اور یہ سب کچھ ایک ذات بابرکات کا فیضِ صحبت ہے۔ پھر انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ان سب کے مربّی کا خلق یہ ہے کہ اپنے پاس سے زرِ فدیہ ادا کرنے پر آمادہ ہے اور انتقام و ہوسناکی سے بالاتر ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر اگر حضرت جویریہؓ کے دل میں روشنی پیدا ہوگئی ہے تو اس پر تعجب کیا ہے؟ آخر اُم حبیبہؓ بھی تو ایک عورت ہی تھیں جن کا باپ (ابوسفیان) فتح مکہ تک ہر مخالفتِ رسول کا ہیرو بنا رہا۔ لیکن وہ اللہ کی بندی نہ فقط ایمان ہی پر جمی رہی بلکہ حبشہ پہنچ کر مہاجرت کی زندگی بھی گزاری۔ حضرت جویریہؓ میں اگر یہی جذبۂ ایمانی پیدا ہوگیا تو اس میں کوئی عقلی استبعاد نہیں۔ پھر ممکن ہے کہ آپؓ کے دل میں یہ خیال بھی آیا ہو کہ میرے حرم رسول بننے کے بعد میری برادری کے قیدیوں کے ساتھ زیادہ بہتر سلوک ہونے لگے۔

اس وقت حضورؐ کے سامنے بھی دو چیزیں تھیں۔ ایک یہ ہے کہ جویریہؓ کو آزاد کر کے ان کے باپ کے ساتھ بھیج دیں لیکن اس سے فقط اتنا ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ ایک سردار زادی آزاد ہو کر اپنے گھر چلی جائے۔ لیکن دوسری طرف جو چیز نظر آرہی تھی اور جو ظہور میں آبھی گئی، یہ تھی کہ حضورؐ نے ان سے نکاح فرما لیا اور

۶۵۔ **پیغمبر انسانیت**، ص ۲۴۳-۲۴۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے نتیجے میں صحابہؓ نے کہا کہ جس خاندان میں حضورؐ نے شادی فرما کر اس سے اپنا صہری وسسرالی تعلق پیدا کر لیا، اس خاندان کے کسی فرد کو ہم قیدی یا غلام بنا کر نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ یہ سارے قیدی بغیر زر فدیہ ادا کیے ایک لمحے میں آزاد ہو گئے۔ بنو مصطلق پہلے ڈاکو تھے۔ اب اس سسرالی قرابت کی وجہ سے اہل اسلام سے قریب تر ہو گئے۔ تعلقات خوشگوار ہوگئے اور دور دور رہنے کی وجہ سے انہیں اسلام اور اہل اسلام کی طرف سے جو غلط فہمیاں تھیں وہ سب دور ہوتی گئیں اور جلد ہی وہ دن بھی آ گیا کہ یہ سب کے سب اسلام لا کر مہذب، تائب، متمدن اور معلم اخلاق بن گئے۔ خود سیدہ جویریہؓ شرف و مجد کے اس مقام پر پہنچ گئیں جہاں ان کا وہم و قیاس بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ ام المؤمنین ہوئیں اور ازواجِ مطہرات کی صف میں کھڑی ہوئیں جن کے ذکر سے کلام الٰہی رطب اللسان ہے(۶۶)۔

نکاح زینبؓ پر بھی قرآن حکیم کی آیات وعقلی استدلال کی مدد سے عمدہ اور مفید بحث کی ہے۔

۵- آنحضورؐ کی مختلف حیثیتوں (یعنی بحیثیت رسول، امیر، قاضی یا جج اور بشر) پر کلامی بحث

اس موضوع پر بحث بھی مولانا پھلواری کی تحقیق لائقِ مطالعہ ہے۔ سیرت نبوی ﷺ سے کئی مواقع ذکر کیے ہیں جہاں صحابہؓ نے آنحضورؐ سے اختلاف کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہؓ بہ آسانی قرائن سے سمجھ لیتے تھے کہ حضورؐ کون سی بات بحیثیت رسول فرما رہے ہیں اور کون سی بات بحیثیت امیر، کون سی بات بحیثیت قاضی فرما رہے ہیں اور کون سی بات بحیثیت بشر کے بطور مشورہ ہے۔ اگر کہیں شبہ ہوتا تو حباب بن منذرؓ یا بریرہؓ کی طرح دریافت کر لیتے تھے۔ ان میں ملکۂ تمیز موجود تھا۔ وحی، امر، قضا اور رائے میں فرق کر لینا ان کے لیے دشوار نہ تھا(۶۷)۔

۶- فتح مکہ میں داخلہ کے احوال و وقائع

فتح مکہ میں داخلہ کے احوال و وقائع بیان کرنے کے بعد ان پر عقلی انداز میں اس بات پر تبصرہ کیا ہے کہ آپؐ نے خون ریزی کو روکنے کے لیے متعدد تدابیر اختیار فرمائیں۔ ان کی طرف قاری کی توجہ مبذول کراتے ہوئے مولانا جعفر پھلواری کہتے ہیں:

۱- سب سے پہلے ابوسفیان کو ایک ٹیلے پر کھڑا کر کے ان کے دل کو مرعوب کر

۶۶- ایضاً، ص ۲۸۹-۲۹۱

۶۷- ایضاً، ص ۳۲۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا گیا تا کہ اس سردارِ قریش کے ساتھ قریش کے حوصلے بھی پست ہو جائیں اور وہ جنگ کی جرأت نہ کرسکیں۔ جس کے نتیجے میں قریش کی شکست کے علاوہ سینکڑوں انسانوں کا خون بہہ سکتا تھا۔

۲- پھر تین طرف سے جیوش قاہرہ داخل کیے گئے تاکہ اہل مکہ ارادہ خون ریزی سے دست کش ہوجائیں۔

۳- پھر سرزمینِ حرم کی حرمت کو باقی رکھنے کی سختی سے تاکید کی گئی۔

۴- پھر ہر اس شخص کو پناہ حاصل ہونے کا اعلان کیا گیا جو کعبے میں داخل ہو جائے اور ابوسفیان کے گھر کے اندر چلا جائے اور حد یہ کہ اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے۔

۵- پھر مقابلے سے الگ رہنے والے کے لیے بھی پناہ کا اعلان کر دیا گیا۔

۶- پھر ہتھیار پھینک دینے والے کے لیے بھی امن کا پیغام سنا دیا گیا۔ پھر زخمی یا امیر ہونے والے پر بھی تلوار اٹھانے کی ممانعت کر دی گئی۔

یہ ہے وہ موقع جہاں انسانی اقدار کا امتحان ہوتا ہے۔ یہ فتح مبین تھی اور ایسی غالبانہ فتح تھی کہ ایک اشارے میں پورا مکہ خاکِ سیاہ بن سکتا تھا۔ فاتحین فتح کے نشے میں سرشار ہوتے ہیں اور دبا ہوا جذبۂ انتقام ابھر آتا ہے۔ چن چن کر لوگوں سے بدلہ لیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں تو فتح کی ایسی نئی قدریں پیش کرنی تھیں جو بلند ترین انسانیت کا مظہر ہوں اور رہتی دنیا تک ہر فاتح کے لیے اسوۂ حسنہ ہو۔ اپنی طرف سے حضورؐ نے ہر وہ ممکن تدبیر کی کہ کسی انسان کا خون نہ بہے[۶۸]۔

۷- واقعۂ ایلا وتخییر

واقعۂ ایلا وتخییر پر علامہ شبلی کے طرز پر معقولی نقطۂ نظر سے بات کی ہے۔ ان واقعات کے بارے میں قرآن حکیم کی آیات ذکر کی ہیں۔ سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۲۸، ۲۹، ۵۲ اور ۵۳ ذکر کرنے کے بعد عقل و حکمت کی نظر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''اللہ اکبر۔ اتنا قوی رشتہ، ایسا دائمی تعلق تو ماں بیٹی، اور پدر و فرزند کا بھی نہیں ہوتا۔ عورتوں کا درجہ بلند کرنے کے لیے ماڈل اور نمونے کی ضرورت تھی۔ حضور اکرمؐ اگر خفا

۶۸- ایضاً، ص ۴۰۱-۴۰۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو کر علیحدگی کی قسم نہ کھاتے تو یہ فضائل اور یہ مسائل کب معلوم ہوتے۔ آیۂ تطہیر بھی آیۂ تخییر سے متصل ہی ہے اور اس کا تخاطب بھی ازواجِ مطہرات ہی سے ہے''[۶۹]۔

''حیاتِ رسول اُمیؐ'' از جناب خالد مسعود

حمیدالدین فراہی کے علاوہ ان کے علمی وارث، جناب امین احسن اصلاحی اور جناب خالد مسعود، فراہی دبستانِ فکر کے نمائندہ علما ہیں جنھوں نے اس نقطۂ نظر کے مطابق تفسیری اور سیرتی ادب کو اپنی علمی و تحقیقی نگارشات سے مالا مال کیا ہے[۷۰]۔

اردو سیرتی ادب میں جناب خالد مسعود(۱۹۵۳ء-۲۰۰۳ء) کی کتاب '' حیاتِ رسول امیؐ'' کو اس مکتبِ فکر کی نمائندہ تصنیف کہا جا سکتا ہے[۷۱]۔ مصنفِ مذکور کے اُستاد مولانا امین احسن اصلاحی نے تفسیر میں

۶۹- ایضاً، ص ۴۳۸- ۴۳۹

۷۰- امین احسن اصلاحی صاحب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے علمی، فکری اور دینی اکتسابات بھی متنوع اور کثیر الجہات ہیں۔قرآن حکیم اور حدیث وسنت کے باہمی تعلق کے بارے میں ان کے نظریات استاد سے اخذ کردہ ہیں۔ اگرچہ بعض مقامات پر انہوں نے اپنے استاد سے اختلاف بھی کیا ہے اور کئی زائد چیزیں بھی اختیار کیں۔ تاہم بنیادی فکر وہی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی کی عربی کتب کو اردو کے قالب میں انہوں نے ڈھالا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ۱۹۳۶ء میں دائرہ حمیدیہ کی ابتدا کی جس کے ذریعے اپنے استاد جناب حمید الدین فراہی کے افکار کی توضیح وتشریح کا فریضہ سرانجام دیا۔ مدرسۃ الاصلاح پر بحثیت مدرس ان کا قیام ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۳ء تک کے عرصہ پر محیط ہے۔ اس دور میں یہ مدرسہ خالص فکر فراہی کا ترجمان اور نقیب رہا۔ قرآن وسنت کے باہمی تعلق کے بارے میں ان کی اہم کتب میں، تفسیر تدبرِ قرآن، مبادی تدبر قرآن، **مبادی تدبر حدیث** (فاران فاونڈیشن، لاہور)، بخاری اور موطاً کی شروحاتِ حدیث (ادارہ تدبرِ قرآن و حدیث، لاہور) نمایاں ہیں۔

۷۱- جناب خالد مسعود (۱۹۵۳ء-۲۰۰۳ء) کا تعلق ضلع جہلم کے قصبہ للّہ کے ایک معروف دینی گھرانے سے تھا۔ دنیوی تعلیم میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیے کنگز کالج لندن سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیا۔ ۱۹۵۸ء میں دینی تعلیم کے حصول کے لیے جناب امین احسن اصلاحی (م:۱۹۹۷ء) کا تلمذ اختیار کیا اور اگلے چالیس برسوں میں ان سے عربی ادب، تفسیر قرآن، اصول تفسیر، حدیث و اصول حدیث وغیرہ علوم میں بھرپور استفادہ کیا۔ انہوں نے مولانا اصلاحی کے موطاً امام مالک اور صحیح بخاری کے دروس کو مدوّن کر کے **تدبر حدیث** کے نام سے شائع کیا۔ ان کی تفسیر **تدبر قرآن** کی روشنی میں ان کے ترجمہ قرآن کے ساتھ تلخیص شائع کی۔ فاضل مصنف نے عربی سے اردو اور بعض سائنسی کتابوں کے انگریزی سے اردو تراجم کیے۔ انہوں نے دینی تعلیمات کی روشنی میں بچوں کے لیے چھ آسان کتابیں بھی لکھیں۔ ۱۹۸۱ء سے اپنی وفات تک برابر ایک سہ ماہی مجلّہ **تدبر** شائع کرتے رہے۔ **حیاتِ رسول امّیؐ** ان کی اہم تصنیف شمار ہوتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نقطۂ نظر کی ترجمانی اپنی تفسیر ''تدبرِ قرآن'' سے کی ہے۔ سیرت کے باب میں اس منہج کا اظہار ''حیاتِ رسول اُمّیؐ'' کی صورت میں خالد مسعود کے قلم سے سامنے آیا ہے۔ یہ فاضل مصنف کے استاد جناب اصلاحی کے اس خواب کی تعبیر اور ان کی خواہش کی تکمیل ہے کہ قرآن مجید اور اصولِ درایت کی روشنی میں سیرت النبی ﷺ پر ایک کتاب لکھی جائے۔ ۱۹۸۶ء میں اسلام آباد میں منعقدہ ایک دینی کانفرنس میں جناب خالد مسعود کو ایک مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی(۷۲)۔ مقالہ کی تیاری کے دوران فاضل مصنف کو قرآن کی حربی تعلیم کو بیان کرنے کے لیے دورِ رسالت کے بعض غزوات کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں دیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس موقع پر فاضل مصنف اپنے احساسات رقم کرتے ہیں:

''مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کہ ان (کتب) کی روایت میں بعض باتیں قرآن کی تصریحات کے سراسر منافی تھیں اور عقلاً بھی ان کی توجیہ ممکن نہیں تھی۔ (انہی واقعات کے بارے میں) بعض (دیگر)روایات قرآن کے مطابق نظر آئیں۔ لیکن معلوم ہوا کہ سیرت نگار ان کو اہمیت نہیں دیتے اس لیے وہ روایات (یعنی قرآن کی تصریحات کے منافی) لوگوں میں مشہور ہو چکی ہیں، جو قرآن کے بیان کردہ اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں''(۷۳)۔

اس رائے کو آگے بڑھاتے ہوئے انہوں نے غزوۂ بدر، صلح حدیبیہ اور فتح مکہ پر تحقیقی مضامین شائع کیے، جنہوں نے فکرِ فراہی کے اس نقطۂ نظر کو آگے بڑھایا۔ جب جنگوں کے پورے سلسلہ پر ان کی تحقیق قلم بند ہوئی تو اس حلقہ کے اصحابِ علم نے اس کو کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا تقاضا کیا۔ تاہم فاضل مصنف نے اس مجموعہ کو رسول اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ اور آپ ﷺ کے منصبِ رسالت کا یک رُخا اور ناقص تصور خیال کیا۔ لہٰذا رسول اکرم ﷺ کی کامل شخصیت اور آپ ﷺ کی دعوت کا بھرپور تعارف کرانے کے مقصد کے تحت نئے عنوانات قائم کر کے ان پر کام شروع کیا جس کے نتیجہ میں سیرتِ طیبہؐ پر یہ نئی کتاب تیار ہو گئی(۷۴)۔

مصنف کو دورانِ تحقیق اہلِ سیَر کے متعدد بیانات، قرآن حکیم کی تصریحات، درایتِ حدیث، عقل و حکمت اور اہلِ عرب کے مزاج و ماحول کے برعکس نظر آئے لہٰذا فاضل مصنف نے مذکورہ واقعات کی نئی ممکنہ

۷۲- فاضل مصنف کے مقالے کا عنوان تھا **قرآن کا تصورِ جنگ** بحوالہ **حیاتِ رسولِ اُمّیؐ**، خالد مسعود، لاہور، دارالتذکیر، ۲۰۰۳، ص ۱۰

۷۳- خالد مسعود، **حیاتِ رسولِ اُمّی**، لاہور، دارالتذکیر، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰

۷۴- حوالہ مذکور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تعبیرات پیش کیں۔ کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو صدیوں سے متفق علیہ واقعات نئی شکل اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مقصدِ تالیف کے ضمن میں جناب خالد مسعود نے مقدمہ کتاب میں ایک اور دعویٰ بھی پیش کیا ہے کہ سیرت کو پیش کرنے میں لوگوں کے سامنے الگ الگ مقاصد رہے ہیں اور کسی بھی سیرت نگار نے رسول اکرم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ، اللہ کے رسول ﷺ ہونے کی حیثیت سے نہیں کیا ہے۔ (لہٰذا) اس کتاب میں (انہوں نے) آپ ﷺ کے منصبِ نبوت و رسالت کا خصوصی مطالعہ کیا ہے۔ یاد رہے کہ اس مکتبِ فکر میں نبی اور رسول کے فرق کو بھی خاص زاویے سے بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں مصنف کی مراد اسی امتیاز سے ہے۔

''حیاتِ رسول امّیؐ'' کا اہم ترین ماخذ: قرآن حکیم

مقدمۂ کتاب میں سیرت النبی ﷺ کے مآخذ بیان کرتے ہوئے انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا ایک مشہور قول نقل کیا ہے کہ کان خلقه القرآن(۷۵)، یعنی حضور ﷺ کا اخلاق و کردار تو قرآن ہی سے متشکل ہوا تھا۔ دوسرے الفاظ میں قرآن میں جو کچھ الفاظ میں ادا ہوا ہے اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو وہ حضور ﷺ کی سیرتِ طیبہؐ بن جاتی ہے۔

فاضل مصنف کے نزدیک قرآنِ حکیم کی کئی آیات میں رسول اللہ ﷺ کا ''ذکر'' یعنی قرآن مجید کے بدل کے طور پر پیش کیا گیا ہے(۷۶)۔ گویا قرآن اور رسول حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ ایک الفاظ کی شکل میں ہے تو دوسرا انسانی شکل میں ہے۔ قرآن پڑھیے تو اس میں رسول اللہ ﷺ کی ذات و صفات، آپؐ کی بعثت کے کوائف، دعوتِ دین کے مراحل، ہجرت، جنگوں کے واقعات، مشرکین اور یہود کے ساتھ اہم بحثوں اور حضور ﷺ کی زندگی سے متعلق دیگر موضوعات کا بیان ملتا ہے۔ ایک آدمی قرآن کا مطالعہ غور سے کرے تو وہ سیرت النبی ﷺ کے تمام ضروری مباحث سے آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ قرآن مجید میں سیرت کے مختلف اور متعدد پہلو ہر اعتبار سے محفوظ اور موجود ہیں۔ فاضل مصنف نے قرآن حکیم اور سیرتِ نبوی ﷺ کے اس قریبی باہمی تعلق کی بنا پر قرآن حکیم کی ہر اس آیت سے اعتنا کیا ہے جس کا احوالِ سیرت سے کوئی تعلق بنتا ہو، چاہے وہ تعلق معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ مصنف نے وہ آیات متعلقہ مقاماتِ سیرت پر درج کی ہیں اور واقعات کو اس رخ پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو آیت کے مضامین سے عیاں ہوتا ہے۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

۷۵- احمد بن حنبل، المسند، کتاب، مسند الصدیقة عائشه بنت ابی بکر، حدیث: ۲۴۶۰۱، حدیث السیده عائشه، رقم ۲۳۴۶۰

۷۶- دیکھیے: سورة الطلاق: ۱۰-۱۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مکی دور میں قریش نے دعوتِ دین کی سخت مخالفت کی اور کمزور طبقہ کے مسلمانوں پر ظلم وستم کے کئی حربے آزمائے۔ اس پسِ منظر میں فاضل مصنف لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے لیے ان حالات کا مقابلہ طاقت سے کرنا، ممکن نہ تھا۔ کوئی چیز اگر ان کا حوصلہ قائم رکھ سکتی تھی تو وہ اللہ پر توکل، دین پر ثابت قدمی کے اچھے انجام اور آخرت کی کامرانی کا یقین تھا۔ اس موقع کی مناسبت سے متعدد آیات قرآنی نازل ہوئیں۔ چونکہ آدمی دوسرے کی مثال سے سبق حاصل کرتا ہے اس لیے اہل ایمان کی تربیت کی خاطر بنی اسرائیل کے ان نوجوانوں کا حوالہ دیا گیا جو فرعون کے تشدد کے اندیشہ کے باوجود (سیدنا) موسیٰؑ کا ساتھ دینے والے بنے۔ انہوں نے جب اپنے رسول سے فرعونوں کے ظلم کا تذکرہ کیا تو انہوں نے ان کو اللہ پر بھروسہ کرنے اور اسی سے مدد مانگنے کی ہدایت کی'' (۷۷)۔

مصنف نے اس عبارت کے ذیل میں سورہ یونس کی آیت نمبر ۸۳ تا ۸۷ نقل کی ہیں۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: ''جب نوجوانوں کو ان کے کافر باپوں یا رشتہ داروں نے سختیاں کر کے محمد ﷺ کا دین چھوڑنے پر مجبور کیا تو اس صورت حال میں قرآن نے ان کو واضح ہدایات دیں کہ اللہ نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت ضرور کی ہے لیکن والدین کو یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اولاد کو اللہ کے شریک ماننے پر مجبور کریں۔ اس معاملہ میں ان کی اطاعت کی ضرورت نہیں'' (۷۸)۔

قرآنی آیات کے مضامین کی روشنی میں وقائع و احوال کی منظر کشی کرتے ہیں، ہجرتِ حبشہ کے تناظر میں لکھتے ہیں: ''کفار کی جانب سے مسلمانوں کو جو آزمائشیں پیش آرہی تھیں قرآن مجید ان کا عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کرنے کا حکم دیتا اور بشارت دیتا کہ جو لوگ ثابت قدم رہیں گے ان کو ان کی قربانی کا صلہ ان کی توقعات، اندازوں اور قیاسوں سے بڑھ چڑھ کر ملے گا۔ قرآن نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ اگر دیکھو کہ تمہارے وطن کی زمین تم پر تنگ کر دی گئی ہے، جب بھی بددل اور مایوس نہ ہونا۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ اگر اس شہر میں تمہارے لیے اللہ کے دین پر قائم رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی کسی ایسی سرزمین کی طرف فرمائے گا جہاں تم بے خوف و خطر اپنے رب کی عبادت کر سکو گے۔ اللہ تمہیں

۷۷- خالد مسعود، حیاتِ رسولِ امّی، ص ۱۲۰

۷۸- ایضاً، ص ۱۲۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے پناہ عطا فرمائے گا اور رزق بہم پہنچائے گا۔'' فرمایا:

﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ.........

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ. الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ. وَ کَاَیِّنْ مِّنْ دَآبَّۃٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَھَا اَللّٰہُ یَرْزُقُھَا وَ اِیَّاکُمْ وَ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾(۷۹)

چودھویں باب میں اسلام سے قریش کی وحشت کے چھ اسباب بیان کیے ہیں۔ ہر سبب اور قریش کے ہر اعتراض کا قرآن حکیم کی روشن آیات کے حوالے سے ذکر کیا ہے اور قرآن ہی کے دل نشین الفاظ و عبارات سے مذکورہ اعتراض و سبب کا مدلل جواب دیا ہے۔ مذکورہ بالا باب کل ۱۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس باب میں قرآن حکیم کی سورۃ مریم، سورۃ ابراہیم، سورۃ النمل، سورۃ الصافات، سورۃ الروم، سورۃ الحج، سورۃ الاعراف اور سورۃ الانعام اور مختلف سورتوں کی اکسٹھ(۶۱) آیات ترجمہ کے ساتھ نقل کی ہیں۔ اٹھارہویں باب کا عنوان قریش کو عذاب الٰہی کا انداز ہے۔

مذکورہ باب کے کل ۱۶ صفحات میں سورۃ الاعراف، سورۃ الرعد، سورۃ یونس، سورۃ حم السجدۃ، سورۃ القمر، سورۃ السجدہ، سورۃ الانعام، سورۃ بنی اسرائیل وغیرھم میں سے کل انہتر(۶۹) آیات مع ترجمہ لکھی ہیں۔ اکیسویں باب کے آٹھ صفحات پر اکتالیس(۴۱) آیاتِ کریمہ ترجمہ کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ چند ایک مثالیں ہیں جو فاضل مصنف کے قرآن سے استنباط کے حوالے سے بطورِ حوالہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

فاضل مصنف نے صاحبِ قرآن کی سیرت کو قرآن کی نظر سے دیکھا اور پڑھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ قرآن کو بھی ایک موضوع کے طور پر دیکھا ہے۔ قرآن حکیم کے نزول کی ابتدا، مکی سورتوں کی دعوتِ نبوی ﷺ سے مناسبت، جمع و تدوینِ قرآن اور یہود و مشرکین اور منافقین کے قرآن اور صاحبِ قرآن پر اعتراضات، ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ خصوصاً معترضین کے ہر ہر اعتراض و الزام کا تحلیلی و منطقی تجزیہ کر کے معقول اور مدلل جوابات دیے ہیں کہ ان اعتراضات کی سطحیت اور نامعقولیت بالکل عیاں ہوگئی ہے۔ ایسے مقامات پر مصنف کے جذبات میں جوش اور تحریر میں تیزی اور روانی آجاتی ہے۔ اس طرح ''حیاتِ رسول اُمیؐ'' کے مطالعہ سے قرآن فہمی اور سیرت فہمی کا دہرا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے علاوہ اصحابِ سیر کی روایات اور احادیث سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ تاہم یہ اخذ و استفادہ بہت محدود ہے۔ ۵۹۷ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کل ۴۳ مقامات پر کتبِ احادیث کے نام حوالہ جاتی کتب کی فہرست میں مرقوم ہیں۔ بعض دیگر مقامات پر چند احادیث نقل کی ہیں، اور بعض دیگر

۷۹- العنکبوت:۵۶-۶۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقامات پر کتب احادیث کی روایات سے راہنمائی لی ہے تاہم ہر جگہ حوالے کا اہتمام نہیں کیا ہے۔ قدیم کتبِ سیرت میں ابن ہشام، ابن سعد اور علامہ ابن کثیر کی کتب کے نام چند جگہ پر مذکور ہیں۔ کتاب کے قابلِ ذکر مقامات وہ ہیں جہاں فاضل مصنف نے روایاتِ سیرت کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

روایاتِ سیرت کا تنقیدی جائزہ

جناب خالد مسعود نے ابتدائے کتاب میں یہ دعویٰ کیا کہ انہوں نے قرآن مجید کے بعد اُن روایت (احادیث) سے راہنمائی لی ہے جو قرآن کے بیانات کے مطابق ہیں[۸۰]۔ مصنفِ مذکور کے اس جملے کا پسِ منظر حقیقت میں تو اصلاحی مکتبِ فکر کا نظریۂ حدیث ہے جس میں قرآن مجید اور عقل و تدبر کو فیصلہ کن اختیار دیا گیا ہے۔ اس مکتبِ فکر کے نزدیک حدیث میں صحیح وسقیم کا مدار اصلاً متن پر ہے نہ کہ سند پر۔ حدیث اگر عقل کے مسلمات اور (اُن کی رائے میں) قرآن کی تصریحات کے خلاف ہو تو رد کر دی جائے گی چاہے اس کی سند اعلیٰ اور قوی ہی ہو۔ اور چاہے اسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے محدثین ہی نے روایت کیا ہو۔ ذوقِ حدیث اور عملِ معروف متنِ حدیث کی جانچ کی ایک کسوٹی ہیں اور احادیث کا اپنا ایک مجموعی نظام بھی ہے جس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے کسی حدیث کو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کی تاویل و توجیہ ٹھیک طور پر ہو سکتی ہے۔ مختلف احادیث میں تناقض کی صورت میں احادیث کا یہی مجموعی نظام راہنمائی کرتا ہے[۸۱]۔ حدیث کو جانچنے اور پرکھنے کے ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر فاضل مصنف نے روایاتِ سیرت کا تنقیدی وتحقیقی جائزہ لیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں وقائع و احوالِ سیرت کی ممکنہ نئی صورتیں اور شکلیں معرض ظہور میں آئی ہیں۔ ان مقامات پر مصنف کا زورِ استدلال اور زورِ قلم عیاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ چند ایسے مقامات حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت ہاجرہؑ کا نسب

حضرت ابراہیمؑ کے قصہ کے ضمن میں اکثر مفسرین اور متعدد اہل سیر نے بخاری و مسلم کی صحیح روایت کے حوالہ سے یہ بات بیان کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کنعان سے مصر گئے تو مصر کے ظالم بادشاہ نے جس کا تعلق سامی نسل سے تھا، آپؑ کی زوجہ حضرت سارہؑ کے ساتھ بُرا ارادہ کرنا چاہا۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں اور بندیوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ حضرت سارہؑ کے ساتھ فرعون کے برے ارادے کو اللہ تعالیٰ نے ناکام فرمایا جس سے وہ بادشاہ اس قدر متأثر ہوا کہ اپنی بیٹی حضرت ہاجرہؑ کو حضرت سارہؑ کے حوالے کر

۸۰۔ مرجع سابق، ص:۱۱

۸۱۔ امین احسن اصلاحی، **مبادی تدبر حدیث**، فاران فاؤنڈیشن، ص:۵۰، ۵۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے بعد میں حضرت ہاجرہؑ سے شادی کر لی۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے یہودی مفسر تورات ربی شلومو کی تحقیق سے یہی بات بیان کی ہے کہ حضرت ہاجرہؑ فرعونِ مصر کی بیٹی تھیں اس نے سارہ کی خدمت کے لیے اس بیٹی کو ان کے ساتھ کر دیا اور کہا کہ اس کا سارہؑ کے ہاں خادمہ بن کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ بن کر رہنے سے بہتر ہے(۸۲)۔ مولانا حمید الدین فراہی، اہل سیر کی اس تحقیق سے مطمئن نہیں تھے انہوں نے اپنی کتاب ''آنحضرت ﷺ کا سلسلۂ نسب اور اہل کتاب'' میں ہجرت مصر کے واقعہ کو درست قرار نہیں دیا ہے بلکہ ان کے نزدیک ابراہیمؑ جس مصر سے گزرے، وہ کنعان کے جنوب میں عرب کا شمالی و مغربی حصہ ہے اور ابو ملک اس علاقے کا زور آور امیر اور قبیلہ بنو جرہم کا سردار تھا۔ حضرت ہاجرہؑ اس عرب سردار ابو ملک کی بیٹی تھی(۸۳)۔ فاضل مصنف نے ''حیاتِ رسول اُمیؐ'' میں اس تحقیق کو درج کیا ہے اور تائید میں درج ذیل مزید دلائل دیے ہیں۔

۱- کنعان، یعنی عرب کے شمالی حصہ (موجودہ فلسطین) میں بنو قحطان (عربوں) کی ریاستیں موجود تھیں۔

۲- ابو ملک عربی نام ہے۔ کنعان میں ابراہیمؑ اسی کے ہاں ٹھہرے۔

۳- ابو ملک نے ابراہیمؑ کو اپنا حلیف بنایا اور عرب قبائل کے رواج کے مطابق اس حلف کو پختہ کرنے کے لیے اپنی بیٹی ہاجرہ کی شادی ابراہیمؑ سے کر دی۔

۴- یہودیوں نے نسلی تعصب کی بنیاد پر ہاجرہ کو مصری لونڈی قرار دیا ہے۔

۵- ہاجرہؑ نے زندگی بھر بنو جرہم کے ساتھ اپنا تعلق باقی رکھا ہے اور اپنے بیٹے اسماعیلؑ اور ان کی اولاد کی شادیاں اسی قبیلہ میں کی ہیں۔

۶- اس تعلق کی مضبوطی کی دلیل ہے کہ بنو جرہم بعد میں مکہ میں آباد ہوئے(۸۴)۔

۲- بیت اللہ کی تعمیرِ اوّل

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی پہلی تعمیر، اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتوں نے کی۔ حضرت آدمؑ جب زمین پر اُتارے گئے تو تعمیرِ ثانی اُن کے ہاتھوں ہوئی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ جب یہ عمارت منہدم ہوئی تو سیدنا ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کو حکم ہوا کہ وہ اللہ کے اس گھر کو پہلے سے موجود بنیادوں پر استوار کریں۔

۸۲- سلمان منصور پوری، **رحمۃ للعالمین**، ج ۲، ص ۳۶-۳۷

۸۳- خالد مسعود، **حیاتِ رسولِ امّی**، ص ۳۲

۸۴- حوالہ مذکور، ص ۳۲-۳۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فاضل مصنف کے بقول اس روایت کے حق میں کوئی شہادت نہیں ہے اس لیے کہ:

۱- اوّل تو مکہ کا لفظ ہی بتاتا ہے کہ وادی میں پہلے کوئی آبادی نہ تھی۔ مکہ کا لفظ بابلی زبان میں بے آباد جگہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

۲- اگر یہاں پہلے لوگ آباد ہی نہ تھے تو ان کے بغیر بیابان میں آخر معبد کس مقصد سے تعمیر ہوا؟

۳- قرآن میں حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ بیت اللہ ہی کو بیت العتیق (قدیمی گھر) کہا گیا ہے۔

۴- قرآن میں اس گھر کی جس اولیت و قدامت کا ذکر ہوا ہے وہ یروشلم میں واقع بیت المقدس کے مقابلہ میں ہے جو صدیوں بعد سلیمانؑ کے عہد حکومت میں تعمیر ہوا(۸۵)۔

۳- رسولؐ اللہ کے بچپن میں زبیر بن عبدالمطلب کی کفالت

رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک جب ۸ برس ہوئی تو آپ ﷺ کے مشفق دادا جناب عبدالمطلب انتقال کر گئے۔ عام اہل سیر نے لکھا ہے کہ اس کے بعد آپ ﷺ کی کفالت کا ذمہ آپ ﷺ کے چچا جناب ابو طالب نے لیا۔ فاضل مصنف نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق عبدالمطلب نے اپنے بعد اپنے بڑے بیٹے زبیر کو اپنا وصی بنایا تھا۔ لہٰذا حضور ﷺ اب اپنے تایا کے سایۂ شفقت میں آ گئے۔ جناب زبیر کا انتقال اس وقت ہوا جب حضور ﷺ ۲۲، ۲۳ برس کے ہو چکے تھے اور اب آپ ؐ کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ گویا کفالت کا پورا دور آپؐ نے حضرت زبیر کے ساتھ گزارا(۸۶)۔ علاوہ ازیں آپؐ کے تجارتی سفروں کے بارے میں جتنا کچھ روایت میں آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ابتدائی سفر جناب ابوطالب کی معیت میں شام کی طرف ہوئے۔ فاضل مصنف کہتے ہیں کہ حقیقت یہ ہے کہ ابو طالب کوئی امیر آدمی نہ تھے، بمشکل اپنا کنبہ پالتے تھے۔ وہ ٹانگ سے معذور بھی تھے اس لیے تجارتی سفروں پر جانا ان کے لیے مشکل تھا۔ ان کا ذریعۂ معاش عطر فروشی تھا یا کبھی کبھی وہ مقامی طور پر غلّے کی تجارت کر لیا کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی ہمراہی میں بارہ تیرہ سال کے بھتیجے کا اتنے طویل سفروں پر جانا ناقابل فہم ہے۔ حضور ﷺ جناب زبیر کی کفالت میں تھے اور وہ ایک معروف تاجر تھے جو مختلف اطراف میں تجارتی سفر کیا کرتے تھے، لہٰذا جب حضور ﷺ کی عمر سفر کے قابل ہوئی ہو گی تو آپؐ ان کے ہمراہ شام، یمن، بحرین وغیرہ گئے ہوں

۸۵- حوالہ مذکور، ص ۳۶

۸۶- حوالہ مذکور، ص ۸۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گے (۸۷)۔ یہاں پر مصنف نے بحیرا راہب کے واقعے کی بھی تردید کر دی جو اسی طرح کے ایک سفر کے درمیان پیش آیا جو ابو طالب کی معیت میں ہوا تھا۔

۴۔ وحی کا آغاز غارِ حرا سے نہیں ہوا

امام بخاری نے اپنی صحیح میں تقریباً دس سے زائد مقامات پر اور امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں آنحضورﷺ پر پہلی وحی کے نزول کا واقعہ بیان کیا ہے جن کی بنیاد پر مفسرین، محدثین فقہا اور سیرت نگاران کا اتفاق ہے کہ وحیِ رسالت و نبوت کا آغاز غارِ حرا میں سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوا ہے۔''حیاتِ رسول اُمّیؐ'' کے مصنف نے روایت کی اس تعبیر سے اتفاق ظاہر نہیں کیا ہے۔ انہوں نے صحیح بخاری کی ان روایات کی تنقیح کی ہے اور درج ذیل اشکالات وارد کیے ہیں۔

۱۔ حضورﷺ خود یہ بیان نہیں کرتے کہ میرے پاس غارِ حرا میں ایک فرشتہ آیا۔ یہ بیان راوی کا ہے کہ آپﷺ کے پاس فرشتہ آیا۔ فرشتے نے حضورﷺ سے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ اسی لیے حضورﷺ کو جستجو ہوئی کہ کسی صاحبِ علم سے رائے لی جائے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟

۲۔ یہ جان لینے کے بعد کہ علامات، فرشتۂ وحی کی آمد کی ہیں۔ ورقہ بن نوفل نے حضورﷺ سے یہ نہیں کہا کہ آپﷺ اللہ کے رسول مقرر ہوئے ہیں۔ یعنی اس مرحلہ پر انہوں نے حضورﷺ کو نبی یا رسول تسلیم نہیں کیا۔

۳۔ ورقہ بن نوفل پر اگر یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضورﷺ اللہ کے رسول ہیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ آپؐ پر ایمان لا کر ایمان میں سبقت کا اعزاز حاصل نہ کرتے۔

۴۔ فرشتے کا حضورﷺ سے مطالبہ تھا کہ اقرأ۔ یہ لفظ دوسرے کے سامنے پڑھ کر سنانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اس صورت میں اقرأ کا صحیح مفہوم ہو گا کہ لوگوں کو پڑھ کر سناؤ۔

۵۔ فرشتے نے پڑھ کر سنانے کا حکم تو دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ کیا پڑھنا یا کیا سنانا ہے۔ اس وضاحت کو تشنہ چھوڑ کر غائب ہو گیا۔

۶۔ کتبِ حدیث و سیرت میں یہ شہادت نہیں ملتی کہ واقعۂ حرا کے فوراً بعد حضورﷺ نے دینِ اسلام کی تبلیغ شروع کر دی ہو۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس وقت خود آپؐ پر اپنی حیثیت واضح نہ تھی اور نہ ہی کوئی پیغام تھا جسے لوگوں کو سُنانا تھا۔

ان نکات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ واقعۂ حرا میں حضورﷺ کو جو تجربہ ہوا یہ بھی آپؐ

۸۷۔ حوالہ مذکور، ص ۸۵،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی تربیت ہی کا حصہ تھا۔ فرشتۂ وحی کی شخصیت سے تعارف اس کا اصل مقصد تھا۔ حضورﷺ کو یہ پیغام دینا مقصود تھا کہ یہ فرشتہ آئندہ آپؐ کے پاس آنے والا ہے۔ سیرت کے پیغام آپؐ تک پہنچائے گا اور آپؐ کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ ان لوگوں تک پہنچائیں۔ لہٰذا یہ بات صحیح نہیں کہ واقعۂ حرا حضورﷺ کی رسالت کا نقطۂ آغاز تھا اور اس میں پہلی وحی نازل ہوئی تھی (۸۸)۔

مصنف نے فترۃ الوحی یا انقطاع وحی کے کسی عرصہ کو بھی صحیح قرار نہیں دیا۔ ان کے نزدیک جب پہلی مرتبہ وحی نازل ہی نہیں ہوئی تو اس میں انقطاع کیسے ہوسکتا ہے۔ حقیقت میں وحی کا آغاز فرشتۂ وحی کی آمدِ ثانی کا موقع ہے جس میں کچھ عرصہ لگا اور سورہ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔

۵۔ تبلیغ ودعوت کا کوئی خفیہ دور نہ تھا

اکثر اہل سیر نے اپنی اپنی تحقیق سے یہ بات لکھی ہے کہ نبی کریمﷺ نے آغاز بعثت سے تین برس تک دعوت دین کا کام خفیہ طریقے سے سرانجام دیا۔

جناب خالد مسعود نے اہل سیر کے اس بیان کا بڑی شدّ ومد کے ساتھ انکار کیا ہے۔ ان کی رائے میں جب کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے تو وہ اس قوم کو مخاطب کر کے اللہ کا یہ پیغام دیتا ہے کہ لوگ اپنے غلط عقیدہ وعمل کو چھوڑ کر اللہ کے بندے بن جائیں۔ اس مقصد کے لیے وہ لوگوں کی فطری نیکی کو ابھارتا، غلط کاموں پر متنبہ کرتا، نصیحت وموعظت کے ذریعے خدا کی بتائی ہوئی راہ راست کو اختیار کرنے کی تلقین کرتا اور قوم کی فکری وعملی رہنمائی کرتا ہے۔ ان میں سے کوئی کام خفیہ کرنے کا نہیں ہوتا۔ رسول کی ذمہ داری کی نوعیت سازش کر کے انقلاب برپا کرنے کی نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جدوجہد کو لوگوں کی نظروں سے چھپا کر رکھے اور اپنی جماعت کھڑی کر کے ایسے افراد مہیا کرے جو قوم کے اندر رائج نظام کو تلپٹ کر کے اس کے تجویز کردہ نظام کو نافذ کر دیں (۸۹)۔ مصنف کے نزدیک چوں کہ پیغمبر کا کام جان جوکھم میں ڈالنے کا ہوتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیتا ہے لہذا رسول کو کسی بھی مرحلہ پر اپنی قوم کے کسی سخت ردعمل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی دعوت کو خفیہ رکھنے پر مجبور ہو (۹۰)۔

۶۔ واقعۂ معراج اور دیگر معجزات

''حیاتِ رسول اُمّیؐ'' میں بعض مقامات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف پر سر سید کے

۸۸۔ حوالہ مذکور، ص ۱۰۰-۱۰۳

۸۹۔ حیاتِ رسولِ اُمّی، ص ۱۰۹

۹۰۔ حوالہ مذکور، ص ۱۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہبی افکار کا بھی اثر ہے۔ سر سید نے ''خطبات احمدیہ'' کے گیارہویں خطبہ میں واقعۂ معراج کے اسراء والے حصہ کو تسلیم کیا لیکن معراج کی روایت کو باہم متعارض اور متناقض دکھا کر اسے ایک خواب اور مُکاشفہ قرار دیا اور اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ جناب خالد مسعود نے بھی واقعۂ معراج کے بارے میں تقریباً انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ روایتِ معراج میں آپ ﷺ کی چند انبیاء سے ملاقات کا ذکر ہے۔ مصنفِ کتاب نے روایت کے اس حصہ پر اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ چند بڑے رسولوں مثلاً حضرت نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ اور شعیبؑ کے نام ملاقات کرنے والوں میں شامل نہیں ہیں۔ ان عوامل کی بنیاد پر انہوں نے اسراء کو اصل اور معراج کو سراسر ایک اضافہ قرار دیا ہے[۹۱]۔ ''حیات رسول اُمّی'' میں دیگر معجزات، جیسے شقِ صدر، بحیرا راہب کا واقعہ، بیعتِ عقبہ ثانیہ میں آپ ﷺ کا شیطان کو کنکری مارنا وغیرھم کا ذکر بھی نہیں ہے۔

۷۔ حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کی روایت کا محاکمہ

مصنف نے حضرت عمر فاروقؓ کے قبولِ اسلام کی معروف روایت جو سیرت نگاروں نے نقل کی ہے، پر کئی سوالات اور اشکالات وارد کر کے اس پر عدم اطمینان ظاہر کیا ہے۔ اس معاملے میں ایک دوسری روایت کو ترجیح دی ہے جس کے مطابق حضرت عمرؓ کا قبولِ اسلام ایک تدریجی عمل ہے۔ ان کے قبول اسلام کے اہم اسباب میں مظلوم مسلمانوں کی اپنے عقیدے و نظریے سے شدید وابستگی، مظالم پر صبر، رسول اللہ ﷺ کی جاذب نظر شخصیت اور قرآن کے اثر آفرین کلام کا وقتاً فوقتاً سننا ہے[۹۲]۔

۸۔ غزوات کا خصوصی تذکرہ

مصنف نے غزوات کے ابواب میں خوب دادِ تحقیق دی ہے اور اس موضوع پر سر سید احمد خان اور علامہ شبلی کی آراء کو ایک نئے قالب و اسلوب میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ علامہ شبلی کی طرح مصنف نے غزوۂ بدر کو ایک اقدامی غزوہ قرار دیا اور ابو سفیان کے قافلہ کو اس کی اہم وجہ ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

اسیرانِ بدر کے معاملے میں جناب خالد مسعود نے ان احادیث اور اہل سیر کے بیانات کو قرآن کے مفہوم سے متعارض قرار دیا ہے۔ روایات کے مطابق جنگِ بدر میں قید ہونے والے قریش کے ستر آدمیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کا مشورہ یہ تھا کہ ان قیدیوں کو ان کے اہل ایمان رشتے داروں کے حوالے کر دیا

۹۱۔ حوالہ مذکور، ص ۲۳۵

۹۲۔ حوالہ مذکور، ص ۱۵۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے تاکہ وہ ان کی گردنیں مار دیں۔ اسی سے اہل کفر کو بھی سخت پیغام دیا جائے گا اور قبائلی دشمنی کا اندیشہ بھی نہیں ہوگا۔ حضرت ابو بکرؓ کی رائے اس سے مختلف تھی۔ آنحضورﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کے مشورہ کو قبول فرماتے ہوئے ان سے زرِ فدیہ لینے کا فیصلہ فرمایا۔ کتب حدیث و سیرت سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس پر سورۃ الانفال کی آیت نمبر ۶۸ اور ۶۹ نازل ہوئیں اور آنحضورﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کے اس نرم رویہ پر تنبیہ کی گئی۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ عتاب صرف مسلمانوں پر تھا۔ نبیﷺ کی ذات اس سے مامون تھی۔ کتاب زیرِ تبصرہ کے مصنف نے ان روایات پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور آیتِ کریمہ کی ایسی تاویل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زرِ فدیہ کی یہ تمام کاروائی نہ اسلامی تعلیمات کے خلاف تھی نہ مصالح کے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم و اذن سے ہوئی اور اس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں[۹۳]۔

معروف سیرت نگاروں نے چند روایات کی بنیاد پر غزوۂ بنی نضیر کے اسباب بتائے ہیں۔ فاضل مصنف نے ان بیان کردہ اسباب و روایت کی تحلیل و تنقیح کی اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ غزوۂ بنی نضیر کے اسباب بیان کرنے میں سیرت نگاروں سے تسامح ہوا ہے[۹۴]۔ جناب خالد مسعود نے بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضرت عباسؓ کی موجودگی کی روایت پر بھی متعدد اشکالات وارد کیے ہیں۔ عام اہل سیر نے بیان کیا ہے کہ دوسری بیعت عقبہ کے موقع پر نبی اکرمﷺ کے ساتھ حضرت عباسؓ بھی موجود تھے تاکہ اپنے بھتیجے کے معاملے میں موجود رہیں اور ان کے لیے پختہ اطمینان حاصل کر لیں۔ سب سے پہلے بات بھی انہوں نے شروع کی[۹۵]۔ امام احمدؒ بن حنبل نے حضرت جابرؓ کی زبانی یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ اس میں بھی حضرت عباسؓ کی موجودگی ثابت ہے اور انہوں نے آپﷺ کا دستِ مبارک پکڑا ہوا تھا[۹۶]۔ ''حیاتِ رسول اُمیؐ'' کے مصنف نے اپنے مؤقف کے حق میں عقلی دلائل دیے ہیں اور ان بیانات کو قابلِ اعتنا قرار نہیں دیا ہے[۹۷]۔ اسی طرح غزوۂ احد کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے فاضل مصنف نے ان روایات کو غلط فہمی پر مبنی قرار دیا ہے جن میں یہ مروی ہے کہ حضورﷺ مدینہ کے اندر رہ کر جنگ کرنے کی خواہش رکھتے تھے[۹۸]۔

۹۳- حوالہ مذکور، ص ۳۴۴

۹۴- حوالہ مذکور، ص ۳۹۰- ۳۹۱

۹۵- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، لاہور، ج ۱، ص ۴۴۰-۴۴۱

۹۶- ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، بیروت، ج ۱، ص ۱۵۹

۹۷- حیاتِ رسولِ اُمّی، ص ۲۵۲-۲۵۳

۹۸- دیکھیے: حوالہ مذکور، ص ۳۷۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاوہ ازیں مقاطعۂ بنی ہاشم، شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر، حضرت عائشہؓ کی عمر اور جمع و تدوین قرآن کی روایات، ایسے کئی موضوعات پر مصنف نے اپنے بیان کردہ اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے غور وفکر کیا ہے اور واقعات وحالات کی ممکنہ نئی شکلیں اور صورتیں اخذ کی ہیں جو عام سیرت نگاروں کے بیانات سے قدرے مختلف ہیں[۹۹]۔

عہد حاضر کے مغربی محققین نے نبی اکرمﷺ کی جدوجہد کو اس کے حقیقی پسِ منظر میں پیش کرنے کی بجائے بالکل دوسرے تناظر میں پیش کیا ہے اور آنحضورﷺ کی جدوجہد کو بھی ایک دنیادار لیڈر کی تگ و دو کے طور پر دیکھا ہے۔ مستشرقین نے دیدہ دانستہ بعض غلط بیانیوں کا ارتکاب بھی کیا ہے جیسے نبی اکرمﷺ پر وحی کی خاص کیفیت کو العیاذ باللہ مرض کا نام دینا، قرآن کی تالیف میں اہل کتاب علما کی معاونت کا الزام لگانا، ہجرت مدینہ، صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور دیگر غزوات کو غلط رنگ میں پیش کرنا وغیرہ۔ ایسے مواقع پر مصنف سیرت نبویﷺ کے مختلف پہلوؤں کو عصر حاضر کے مروجہ اسلوب میں پیش کرتے ہیں اور عقلی دلائل اور کتبِ سابقہ کے بیانات کی روشنی میں ان کے اعتراضات و الزامات کا جواب دیتے ہیں[۱۰۰]۔

کتاب کا وہ حصہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے جس میں عہد نامہ قدیم و جدید اور دیگر صحائف وکتبِ مقدسہ میں اس عظیم رسولﷺ کی آمد کے اخبار کا بیان ہے۔ مصنف نے عقلی براہین اور نقلی دلائل سے یہ بات پرزور انداز میں ثابت کی ہے کہ انبیائے سابقہ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت یحییٰؑ، حضرت ایوب، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہم السلام جس نبی کی آمد کی اطلاع وخوشخبری دیتے رہے وہ خاتم النبیین ﷺ ہیں۔ اس ثابت شدہ موقف پر اہل کتاب علما اور مغربی مصنفین کے وارد ہونے والے اعتراضات کے مدلل جوابات دیے ہیں۔ مناظراتی اور جدلیاتی اسلوب سے اپنا دامن بچاتے ہوئے تحقیقی انداز اختیار کرتے ہیں تاہم بعض مقامات پر ان کا انداز مناظرانہ اور جواب الزامی نوعیت کا بھی ہوتا ہے[۱۰۱]۔

خلاصۂ بحث

ان کتب میں سوانحی خاکہ کی نسبت فلسفیانہ ونظری افکار کی توضیح میں خوب شرح و بسط سے کام لیا گیا ہے۔ سیرت کے ساتھ تمام مہمات مسائل پر تبصرہ اور قرآن مجید پر بھی پوری نظر ڈالی گئی ہے۔ مصنفین کے

۹۹- حوالہ مذکور دیکھیے: صفحات ۱۹۶-۱۹۹، صفحات ۵۳۵، ۵۶۰، ۱۸۷ اور ص ۱۰۲، ۱۰۳۔

۱۰۰- دیکھیے: صفحات ۱۷۴، ۱۷۵ تا ۱۷۷، ص ۵۰۸، ۵۰۹، ۳۶۳

۱۰۱- حوالہ مذکور ص ۴۰، ۵۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تمام خیالات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا تاہم کتب کے مندرجات متاثر کن، لسانی اعتبار سے پُرکشش اور اس میں عقل کے لیے بھی اپیل ہے۔

فاضل مصنفین کی مذکورہ کتبِ ثلاثہ مندرجات و انداز کے معمولی اختلافات کے باوجود ایک ہی فکر کی آئینہ دار اور ترجمان ہیں۔ اردو سیرتی ادب کے اس اہم مکتبِ فکر نے برصغیر کے دینی ادب پر دور رس اثرات مرتب کیے ہیں۔علمی حلقوں میں ان تحقیقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ پاکستانی جامعات کے علومِ اسلامیہ کے شعبہ جات نے مذکورہ کتب اور ان کے اسلوب و منہج کو ایم۔اے اور ایم فِل کی سطح پر تحقیقی مقالات کا عنوان بنایا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ فاضل مصنفین کے اصولِ تحقیق و تدبر کو اہمیت دی جائے۔ سیرت کے تمام احوال و وقائع پر اسی طرز و انداز میں تدبر کیا جائے۔ وقائعِ سیرت کے ساتھ ساتھ عہدِ صحابہؓ کی تاریخ اور بعد کی مسلم حکومتوں کے ادوار کا مطالعہ اسی منہج و انداز میں کیا جائے۔

© rasailojaraid.com